www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

نومبر 2020

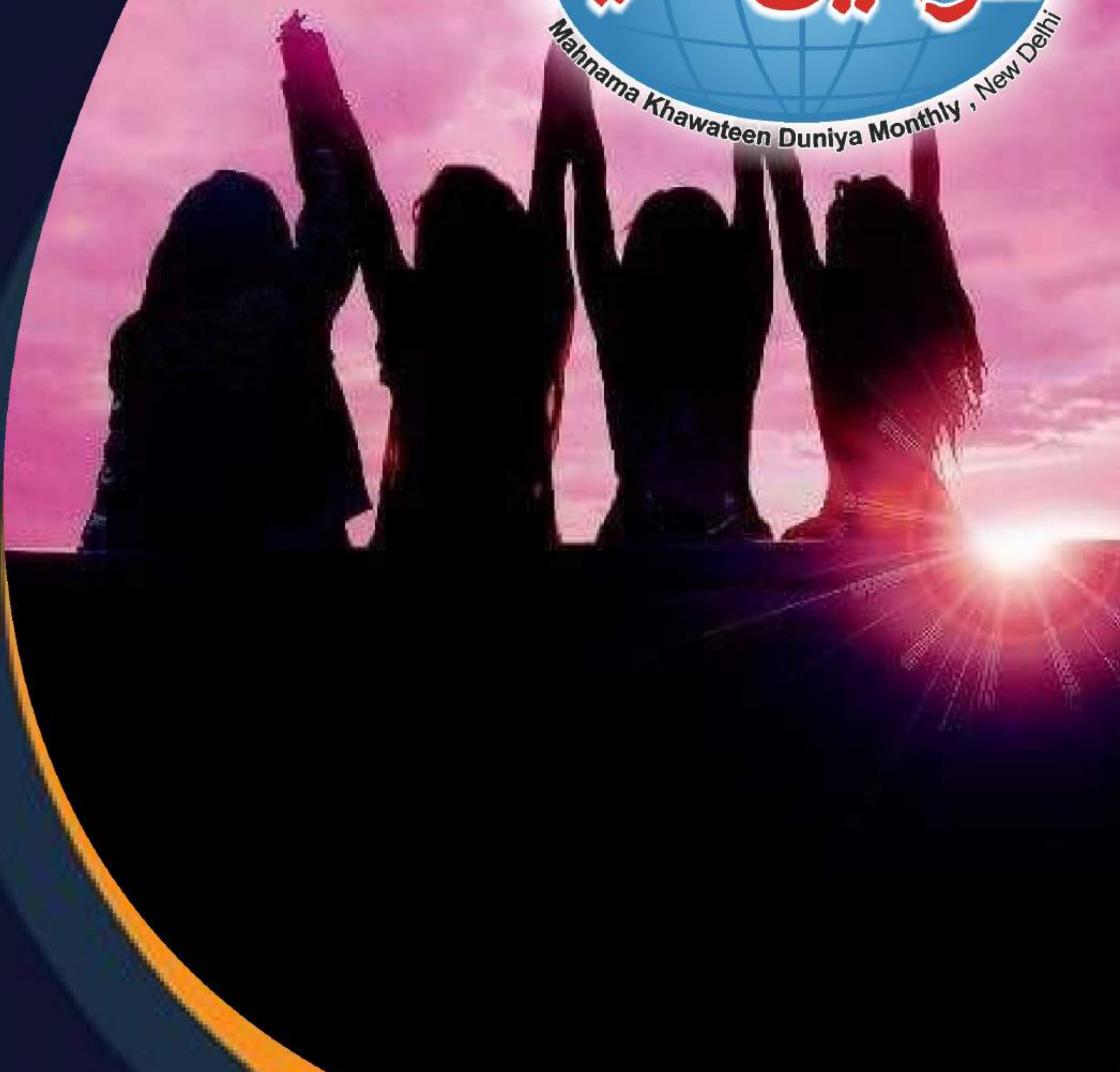

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ **بچوں کی دنیا** دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

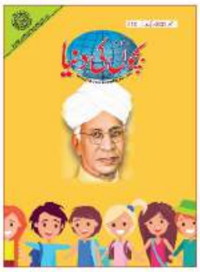

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

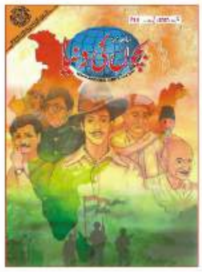

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	فہمیدہ ریاض کی شاعری میں نسوانی حسیت	ڈاکٹر مسرت	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		10
جہان نسواں	اقبال اور پیام مشرق	ڈاکٹر رئیسہ پروین	11
	نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں جزئیات نگاری	ڈاکٹر فریدہ بیگم	17
	مجری ادب کی قوی آواز عشرت معین سیما	ڈاکٹر شاہد الرحمٰن	21
	علی باقر کا افسانوی فن	ڈاکٹر شیریں ناز	25
	سیدہ جعفر کے تحقیقی وتنقیدی کارنامے	ڈاکٹر محمد اشتیاق احمد	28
	تانیثیت اور اردو افسانہ	ڈاکٹر تسنیم فاطمہ	31
	جرمنی کی نمائندہ خواتین افسانہ نگار	مہوش نور	35
	پروین شیر کا سفرنامہ 'چند سیپیاں سمندروں سے'	محمد رکن الدین	39
	رپورتاژ 'بھوپوشیما': ایک جائزہ	محمد انصر	43
کہانیاں	کھرنڈ	غزالہ قمر اعجاز	47
	پیاسا دریا	شبیہ زہرا حسینی	50
حسن سخن	فرحانہ نازنین		54
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		55
صحت	پی سی او ڈی اور ہومیوپیتھی	ڈاکٹر بشریٰ اشرف	57
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		60
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		61

آدھی آبادی کی جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد: 4 شمارہ: 11 نومبر 2020

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

زندگی کے ہر میدان میں خواتین نے بلند اڑان کی داستان رقم کی ہے۔ خاص طور پر دور جدید میں ویمن امپاورمینٹ کی وجہ سے خواتین میں سماجی، سیاسی، ثقافتی بیداری کی لہر پیدا ہوئی ہے اور آج کسی بھی محاذ پر خواتین پیچھے نہیں ہیں۔ خواتین کو اپنی تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں کا بھی احساس ہو چکا ہے اسی لیے ادب کے میدان میں بھی خواتین اپنے قدم تیزی سے آگے بڑھا رہی ہیں اور مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کر رہی ہیں۔ ادب کی کوئی ایسی صنف نہیں ہے جس میں خواتین نے اپنے کمال ہنر کا ثبوت نہیں دیا۔ خاص طور پر فکشن اور شاعری کے میدان میں خواتین حیات و کائنات کی نئی نئی جہتیں تلاش کر کے اپنے تجربات اور مشاہدات کو تخلیقی پیکر میں ڈھال کر دنیا کو روشناس کرا رہی ہیں اور یہ خوش آئند بات ہے مگر ان تمام کامرانیوں اور حصولیابیوں کے باوجود خواتین کی یہ شکایت بجا ہے کہ انھیں نظر انداز کرنے کی مردانہ روش ابھی بھی برقرار ہے اور انھیں اپنے خیالات کے مکمل اظہار کی اتنی آزادی نہیں ہے جتنی مرد معاشرے کو حاصل ہے۔ ان کے ابھی بھی بہت سے مسائل ہیں جن پر مرد اساس معاشرہ توجہ نہیں دے رہا ہے نہ ہی ان کی صلاحیتوں کو پوری طرح اجاگر ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ معاشرے کے اسی رویے اور روش کی وجہ سے خواتین کو ہر عہد میں ایک پلیٹ فارم کی ضرورت کا احساس رہا ہے۔

قومی اردو کونسل نے خواتین کے انہی مسائل و مشکلات کے پیش نظر 'ماہنامہ خواتین دنیا' کی اشاعت کا آغاز 2017 میں کیا تھا اور اس میں خواتین کے مسائل اور متعلقات پر مرکوز تخلیقات کی اشاعت پر زیادہ زور تھا۔ مقام شکر ہے کہ خواتین دنیا کی شکل میں طبقۂ نسواں کو نہ صرف ایک ترجمان مل گیا بلکہ خواتین کو اپنے جذبات و احساسات اور اپنی صلاحیتوں کے اظہار کی ایک بڑی اچھی صورت بھی میسر آ گئی۔ اس رسالے میں نہ صرف خواتین کی تخلیقات شائع کی جاتی ہیں بلکہ ان کے روزمرہ کے مسائل اور مشکلات کے حوالے سے بھی تحریریں ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بہت کم عرصے میں 'خواتین دنیا' نے صرف عورتوں میں نہیں بلکہ پورے معاشرے میں مقبولیت حاصل کی ہے اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

یہ رسالہ 'خواتین دنیا' آج کی خواتین کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کر رہا ہے کیونکہ آج پہلے کی طرح خواتین کے لیے مخصوص رسالوں کی اشاعت بہت کم ہو گئی ہے اور جو بھی نسائی رسائل و جرائد ہیں ان میں سے بیشتر کا ارتکاز صرف فکشن اور شاعری پر ہے ان میں خواتین کے اہم مسائل اور موضوعات کے حوالے سے تحریریں بہت کم ہوتی ہیں۔ 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں خواتین کی تخلیقات کے علاوہ عورتوں کے اہم مسائل اور موضوعات پر معروضی اور منطقی مکالمے بھی شامل ہوتے ہیں اور اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ خواتین میں ہر سطح پر بیداری پیدا ہو سکے، وہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کر سکیں اور اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کر سکیں۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر مسرت

فہمیدہ ریاض کی شاعری میں نسوانی حسیت

فہمیدہ ریاض ایک ایسی شاعرہ ہیں جو اردو شاعرات میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ان کی بیشتر شاعری نسائی حسیت اور تانیثی پہلوؤں پر مبنی ہیں۔فہمیدہ ریاض کی شاعری میں ایک ایسی عورت کا تصور ابھرتا ہے جس کو معاشرے کے بنائے ہوئے ان تمام بے جا اصولوں سے انحراف ہے جو ایک عورت پر زبردستی تھوپ دیے جاتے ہیں۔ان کی شاعری میں کہیں کہیں مزاحمت مردوں کے اس رویے سے پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ سے عورتوں کو معاشرے میں وہ حقوق نہیں مل پاتے جس کی وہ حق دار ہوتی ہیں۔فہمیدہ ریاض کی شاعری کے بارے میں مرتضٰی علی اطہر نے اپنی کتاب ''فہمیدہ ریاض کی شاعری میں جدید عورت'' میں لکھا ہے:

> ''فہمیدہ ریاض نے اپنی شاعری میں سیاسی اور سماجی موضوعات کے ساتھ ساتھ سائنسی اور میکانکی موضوعات مناظر فطرت، انسان دوستی اور نفسیاتی اور جنسی موضوعات کو بھی باندھا ہے لیکن ان کی شاعری کی مرکزی فکر ''عورت'' اور اس سے متعلق مسائل ہیں۔ان کے یہاں عورت کی زندگی سے متعلق مختلف موضوعات پر کثرت سے نظمیں موجود ہیں۔اگر ان کے کلام کا تاریخی اعتبار سے تجزیہ کیا جائے تو عورت کی حسیت کے تعلق سے ان کے یہاں فکری ارتقا صاف نظر آتا ہے۔''

(فہمیدہ ریاض کی شاعری میں جدید عورت، مرتضٰی علی اطہر، کتابی دنیا، دہلی 2009، ص 67-68)

مرتضٰی علی اطہر کی رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔فہمیدہ ریاض نے اپنی نظموں کے ذریعے سب سے زیادہ طنز ان مردوں پر کیا ہے جو عورت کو محض سامان عیش سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی بھی قسم کا ناروا سلوک کرنے سے نہیں چوکتے۔

ان کی بیشتر نظمیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ انھوں نے نسائی درد کو بہت قریب سے محسوس کیا اور اس کا برملا اظہار اپنی شاعری کے ذریعے کیا۔صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اکثر مقامات پر تو ان کا لہجہ اتنا تیکھا اور تلخ ہو گیا ہے کہ قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔خود انھوں نے جلاوطنی کی زندگی ایک لمبے عرصے تک گزاری جس کا اثر ان کے ذہن پر پڑنا فطری تھا۔جنس کو انھوں نے اپنی نظموں میں بیشتر مقامات پر موضوع بنایا ہے ان کی نظموں

کو پڑھتے ہوئے یہ احساس شدت سے ہوتا ہے۔'چادر اور چار دیواری' کی پاداش میں ان پر مقدمے بھی چلے اور ان کو جلا وطن بھی کیا گیا۔صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اکثر مقامات پر تو بہت ہی حساس جذبوں کے ساتھ اپنی شاعری میں نمودار ہوتی ہیں۔فطری جذبات کی عکاسی کرنے میں بھی ان کو کمال حاصل ہے۔ان کی شاعری کا کینوس وسیع ہے۔وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کا خواب دیکھتی ہیں جہاں عورت اور مرد کے مابین کوئی تفریق باقی نہ رہے۔جہاں دونوں کو مساوی حقوق میسر ہوں۔ان کی نظموں میں بیشتر مقام پر ایسے معاشرے سے شکوہ ہوا ہے جہاں ان کو عورت کا کردار مجروح ہوتا نظر آتا ہے۔

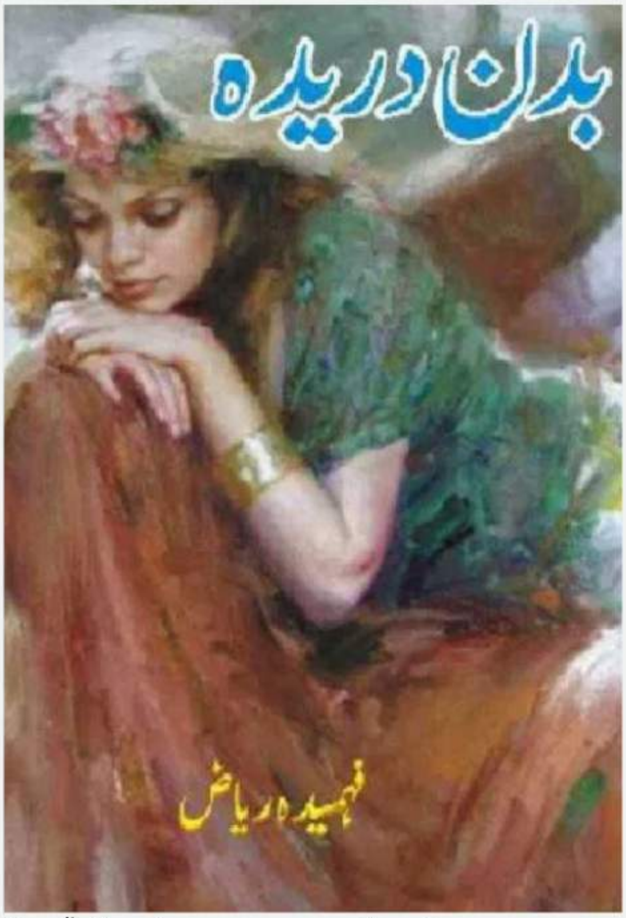

جب وہ معاشرے کے بے جا اصولوں سے انحراف کرتی ہے تو نئے تصوارت سامنے آتے ہیں۔فہمیدہ ریاض نے ذاتی تجربات کے بیان میں جس بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے ان سے پہلے کسی عورت کے قلم سے ان احساسات کی ترجمانی نہیں ہوئی ہے۔انھوں نے نسائی جذبات کو زبان دی ہے۔ان کی یہ نظم ملاحظہ کریں:

میں اپنے حمل کا بوجھ لیے
دھرتی کو ڈھونڈتی آئی
پر دھرتی کہاں ہے میں جس پر یہ بوجھ لے کر بیٹھ سکوں
وہ جنموں کی سنگی میری
جس کی مٹی میں جذب ہوا تھا دودھ مرا
جس کی اتھاہ گہرائیوں میں بیکل ہیں نمو کی تحریکیں

(پلاٹ، بدن دریدہ)

مذکورہ نظم میں ایک ماں بننے والی عورت کے حسین جذبات کی عکاسی فنکارانہ انداز سے کی گئی ہے۔ان کی دیگر نظموں میں بھی کہیں کہیں ایسے جذبات ہمیں نظر آتے ہیں۔

فہمیدہ ریاض کی نظموں میں بے ساختگی اور معصومیت بھی نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں مردانہ سماج سے بغاوت کے ساتھ ساتھ محبت کے نازک لمحوں کی پکار بھی ہے۔وہ اس سے بے لوث محبت اور بے غرضی کی متقاضی نظر آتی ہیں اور محبوب کی منتظر ہیں:

عشق آوارہ مزاج
وہ مسافر تو گیا
نہ کوئی اس کی مہک ہے کہ جو دے اس کا پتہ
نہ کوئی نقش کف پا
نہ کوئی اس کا نشاں
کوئی تلخی بھی تہہ جام نہ چھوڑی اس نے
زندگی باقی ہے
ایک سنجیدہ ہنسی
سوچ سی دل میں بسی
تیز آئی ہوئی سانس
ذہن میں تھوڑے وقفے سے کھٹکتی ہوئی پھانس
اور دکھتا ہوا دل
چوٹ تھی جس پہ لگی
چوٹ ویسی تو نہیں
درد باقی تو نہیں
لاکھ مانے نہ مگر
کچھ پشیمان سا دل
یوں بدل جانے پر
آپ حیران سا دل
اس کو کیا اپنا پتہ
یہ ہے انسان کا دل

کوئی پتھر تو نہیں
جس پہ مٹی نہیں پڑ جائے جو اک بار لکیر

(عشق آوارہ مزاج، بدن دریدہ)

فہمیدہ ریاض فارسی اور اردو زبان کے ساتھ ساتھ ہندی زبان پر بھی دسترس رکھتی تھیں۔ ہندی زبان میں بھی انھوں نے کچھ نظمیں تخلیق کی ہیں جو ان کی ہندی شناسی کا پتہ دیتی ہیں۔ فارسی زبان میں ان کا اہم کارنامہ فروغ فرخ زاد کی نظموں کے منظوم تراجم ہیں۔ فروغ فرخ زاد کی نظمیں فہمیدہ ریاض کے مزاج سے پورطرح مطابقت رکھتی ہیں۔ انھوں نے مثنوی مولانا روم کا بھی اردو ترجمہ کیا۔ جو تیور فروغ فرخ زاد کی فارسی شاعری میں دکھائی دیتے ہیں وہی تیور ہمیں فہمیدہ ریاض کی اردو شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔

ہم نے دیکھی اک ناری
سانولا رنگ جامنی ساری
اور باتوں میں ایسی چنچلتا
چھوٹے رنگوں کی جیسے پچکاری

(مرقع، بدن دریدہ)

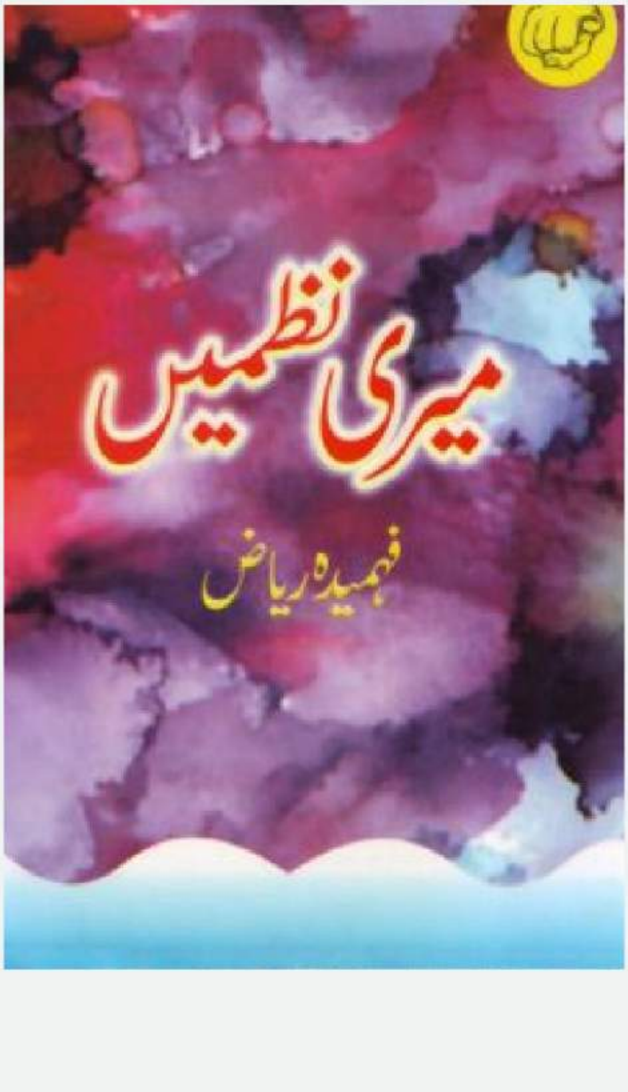

فہمیدہ ریاض کی شاعری جو باغیانہ تیور اور تلخ انداز لیے ہوئے ہیں وہ پڑھنے والے سے اس کے فطری ذوق کا تقاضہ کرتی ہے۔ طویل مدت تک جلا وطنی کی زندگی گزارنے کے بعد بالآخر ان کی شاعری کو اور فہمیدہ ریاض کی شخصیت کو وہ پہچان ملی جس کی کہ وہ حق دار تھیں۔ شجر ممنوعہ سمجھے جانے والے موضوعات کو انھوں نے اپنی شاعری میں خوب برتا ہے۔ ایسے موضوعات جن کا بیان بہت ڈھکے چھپے انداز میں کیا جاتا ہے فہمیدہ نے ان موضوعات کو بھی بالکل واضح انداز میں اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ سماجی ناہمواریوں پر ان کا دل کڑھتا ہے۔ معاشرے کی بے جا بندشوں سے انھیں چڑ ہے۔ ان کا بغاوتی لہجہ صرف ان کی ذات تک ہی محدود نہیں ہے۔ معبود حقیقی کی تعریف بھی دیکھیں:

الحمد اللہ رب العالمین
سب تعریفیں خدا کی ہے، جو ہے بہت عظیم
کیسی سوچ نے میرے دل میں چٹکی لی
کیسے دھیان سے میری آنکھیں بھر آئیں
سینے میں کیوں سناٹا سا چھایا ہے
یہ میرے سجدے میں تذبذب کیسا ہے

(اے والی رب وکون ومکاں، بدن دریدہ)

تانیثی فکر ان کی شاعری میں بہت واضح انداز میں سامنے آئی ہے۔ فہمیدہ ریاض کی اکثر نظموں میں عورت کے مختلف روپ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شادی شدہ عورتوں کے جذبات کی عکاسی کرنے میں بھی ان کو ملکہ حاصل ہے۔ ایک لڑکی سے بیوی اور بیوی سے ماں بننے تک کے سفر میں جو سرشاری ہوتی ہے اس کا اظہار انھوں نے فنکارانہ لیکن سادہ زبان میں کیا ہے۔ لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا اسی قبیل کی نظم ہے:

لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا
چھو کے میرا بدن
اپنے بچے کے دل کا دھڑکنا سنو
ناف کے اس طرف
اس کی جنبش کو محسوس کرتے ہو تم؟
بس.....یہیں چھوڑ دو
تھوڑی دیر اور اس ہاتھ کو میرے ٹھنڈے بدن پر یہیں چھوڑ دو
میرے بے کل نفس کو قرار آ گیا

(لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا، بدن دریدہ)

مذکورہ نظم کے ذریعے ایک عورت کے احساسات اور جذبات کو بخوبی سمجھا جا

سکتا ہے جو فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے بطن سے ایک نئے وجود کو جنم دیتی ہے۔

فہمیدہ ریاض ایسے معاشرے سے نالاں ہیں جہاں عورت کو صرف جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی زندگی کو تسکین کا باعث سمجھنے والوں سے ان کو شدید اختلاف ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ عورت کی ذات کو بھی خدا نے تکمیلیت بخشی ہے پھر مردانہ سماج اس سے انحراف کیوں برتتا ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ اپنے وجود کو منوانے کی کوشش بھی کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری اپنے وجود کا اثبات چاہتی ہے۔ وہ اس بات پر بہت زور دیتی ہیں کہ عورت کے وجود کو بھی معاشرے میں وہی مقام اور مرتبہ ملنا چاہیے جو مردوں کو حاصل ہے۔ انھیں عورت کی تذلیل جب محسوس ہوتی ہے تو ان کے قلم میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ نظم دیکھیں:

وہ اک زن ناپاک ہے
بہتے لہو کی قید میں!
گردش میں ماہ و سال کی
دہکی ہوس کی آگ میں
اپنی طلب کی چاہ میں
زائیدۂ ابلیس تھی
چل دی اسی کی راہ میں
اس منزل موہوم کو
جس کا نشاں پیدا نہیں
سنگم و نور و نار کا
جس کا پتہ ملتا نہیں

(وہ اک زن ناپاک ہے، بدن دریدہ)

نظم 'ایک لڑکی سے' میں وہ ایک لڑکی کو کردار کرتے ہوئے اس کے ذریعے ایسی باتیں کہلواتی ہیں جو بہت باہمت ہے اور روایتی اصولوں سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتی ہے:

سنگ دل رواجوں کی
یہ عمارت کہنہ
اپنے آپ پر نادم
اپنے بوجھ سے لرزاں
جس کا ذرہ ذرہ ہے
خود شکستگی ساماں
سب خندہ دیواریں
سب جھکی ہوئی گڑیاں
سنگ دل رواجوں کے
خستہ حال زنداں میں
اک صدائے مستانہ
اک رقص رندانہ
یہ عمارت کہنہ ٹوٹ بھی تو سکتی ہے
یہ اسیر شہزادی چھوٹ بھی تو سکتی ہے
یہ اسیر شہزادی

(ایک لڑکی سے، بدن دریدہ)

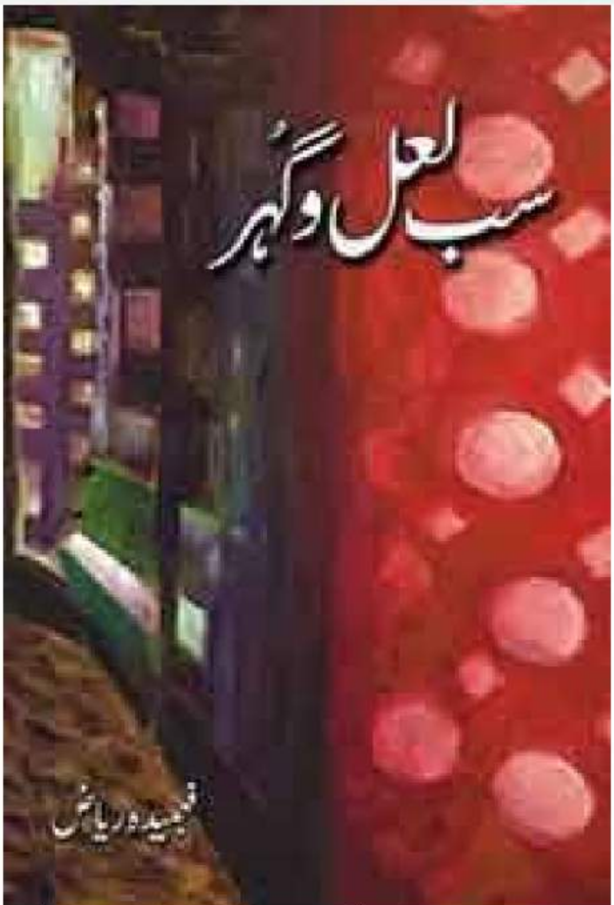

مذکورہ نظم میں ایک ایسی لڑکی کا عکس ابھر کر سامنے آتا ہے جو اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے تئیں پرعزم ہے اور اپنی ہمت و حوصلے اور عزم سے معاشرے کو بدلنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

ان کی نظموں کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مرد و عورت کے مابین جنسی رشتے کو بالکل عریاں انداز میں قاری کے سامنے لاتی ہیں۔ عورت کی گھٹن اور بے بسی کو انھوں نے اپنی نظموں میں بہت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ ایسے معاشرے کی متلاشی نظر آتی ہیں جہاں ان

کی ذات تکمیلیت کو پہنچی ہوئی ہو۔ وصل کا بیان دیکھیں:

وصل اک کرن بن کر
روح میں دمکتا ہے
جس کا ایک لمحہ
وصل سے پرے لیکن
اک اجاڑ سناٹا

(وصل اک کرن بن کر، بدن دریدہ)

فہمیدہ ریاض کی شاعری میں عورت کے مختلف روپ ابھرتے ہیں۔ ان کا بغاوتی لہجہ مدھم انداز میں سامنے آتا ہے۔ ان کی شاعری میں جو گھن گرج نظر آتی ہے وہ وقت اور حالات کی دین ہے۔ جلا وطنی کی ایک طویل مدت نے ان کے خیالات میں ندرت پیدا کی اور انھوں نے جو کچھ محسوس کیا اس کو اپنی شاعری کے ذریعے پیش کر دیا۔ انھیں کسی بھی روپ میں عورت کی تذلیل گوارہ نہیں ہے۔ انھوں نے جنسی جذبات تک ہی اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ مختلف موضوعات پر انھوں نے نظمیں کہیں ہیں۔ مناظر فطرت کی عکاسی بھی انھوں نے مختلف پیرایہ اختیار کیا ہے:

ذرہ ذرہ مہک رہا ہے
اس خوشبو کو
اس جادو کو
کیسے اپنے دل میں بسالوں
اس احساس بہار کو کیسے امر بنالوں

(ابر بہار، بدن دریدہ)

موجودہ دور میں جب کہ ترجیحات بالکل مختلف ہوتی جارہی ہیں ہر چیز کو پرکھنے کے پیمانے مختلف ہوتے جارہے ہیں ایسے میں فہمیدہ ریاض کی نظمیں خواتین میں حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔ خواتین آج مختلف میدانوں کو عبور کرتے ہوئے اپنے وجود کا اثبات کروانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ خواتین کے تئیں مردوں کے رویے میں بھی تبدیلی آرہی ہے۔

فہمیدہ ریاض کا مزاج عشق کی لطیف نزاکتوں سے بھی میل کھاتا ہے۔ عشق کی مختلف کیفیات کو بیان کرنے میں بھی وہ کامیاب نظر آتی ہیں۔ محبوب کے ہجر وفراق اور وصال کو انھوں نے مختلف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ سادہ اور عام زبان میں وہ اپنی بات کہتی ہیں۔ بعض نظموں میں تنوع اور تازگی کا احساس ہوتا ہے:

دنیا کی طبی راہوں پر، ہم یوں تو چلتے جاتے ہیں
کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو یاد ہمیشہ آتے ہیں
وہ راہ بدلتے ہیں اپنی اور مڑ کر ہاتھ ہلاتے ہیں
لیکن وہ دلوں کو، یادوں کی خوشبو بن کر مہکاتے ہیں

(کچھ لوگ، پتھر کی زبان)

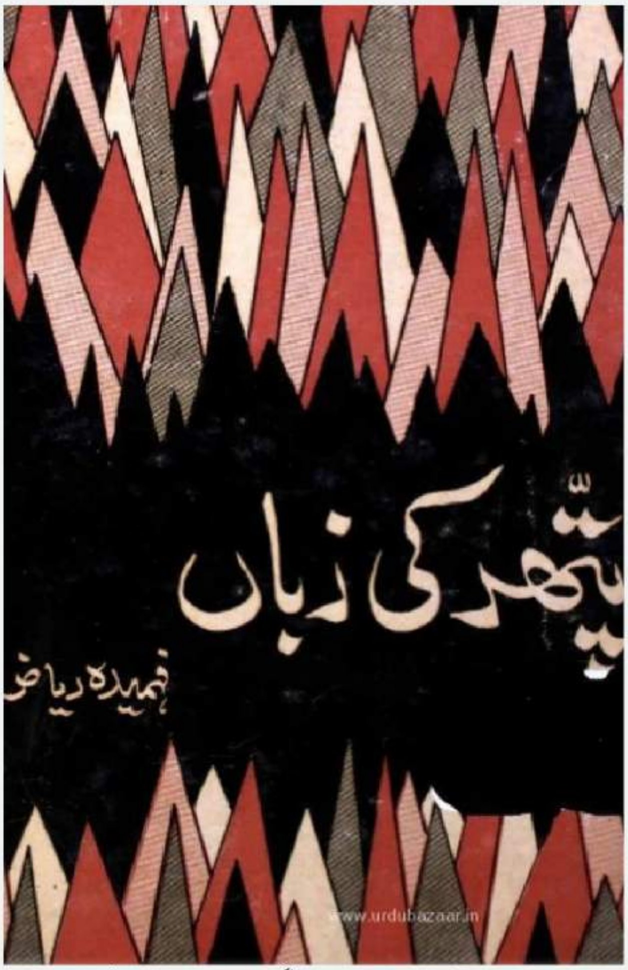

فہمیدہ ریاض حالات کی زد میں رہی ہیں لیکن انھوں نے حوصلہ نہیں ہارا ہے بلکہ اپنے مسئلوں سے تنہا ہی لڑتی نظر آتی ہیں۔ ان کی نظموں میں سیاسی جبر، زمانے کی تلخیاں اور خواتین کے تئیں بے دردانہ سماج کی بے حسی اور ناانصافی کا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس نظم میں بھی ان کا نسائی احتجاج بالکل واضح ہے۔ یہ اس عورت کا رویہ ہے جو طویل مدت تک گمنامی کے اندھیروں میں رہی ہے لیکن اس کا سماجی شعور اب بیدار ہوا ہے۔ اپنے وجود کی متلاشی وہ اب نظر آتی ہے۔ وہ صدیوں کی نیند سے جاگی ہے اور وہ اب کسی بھی طور پر اپنے وجود کی شناخت کے لیے پیچھے نہیں ہٹے گی۔ وہ اپنے وجود کا اثبات کر رہی ہے۔ اپنے وجود کو منوانے کی فکر اس کے اندر شدت اختیار کر چکی ہے۔

□□□

Dr. Musarrat
New Delhi-110025

شاعرات کے منتخب اشعار

ہو کے خاموش نہ بے کار ہو یہ سازِ وجود
نغمۂ درد کی لئے بڑھائے رکھیے

نہ فرش خاک پہ ٹھہریں گے نقش پا کی طرح
رواں دواں ہیں فضاؤں میں ہم ہوا کی طرح

سیدہ فرحت

پھر کہاں نیلا سمندر کھو گیا
سرمئی صحرا یہ کیسے ہو گیا

ڈوبتے دل کا نظارہ کیا کہیں
جو بھی آیا دیکھنے وہ رو گیا

مریم غزالہ

یاد آتا ہے تمھارا ہر اک انداز مجھے
جب سے بچھڑے ہو دیے جاتے ہو آواز مجھے

خیال تھا کہ ہزاروں شکایتیں ہوں گی
وہ سامنے ہیں تو کہنے کی بات کچھ بھی نہیں

جمیلہ بانو

دل میں طوفان رہیں اور سکوں ساحل پر
ہم کو معلوم ہے کوزے میں سمندر ہونا

اکثر اسی خیال سے راحت ملی مجھے
اپنا نہیں ہے پردہ سلامت کہیں تو ہے

فاطمہ وصیہ جائسی

مطلع بھی بہت صاف تھا اور دھوپ کھلی تھی
کھلتے ہی لفافے میں دھنک اور سجی تھی

منڈوے تھے چنبیلی کے نہ تتلی ہی اڑی تھی
اونچے تھے محل اور وہ گملوں میں سجی تھی

صغریٰ عالم

کتنے کومل دل گھائل ہیں کوئی نہیں جانے حسنٰی
پیار کی رنگیں بستی میں چاند کی شیتل چھاؤں میں

یہ کس کی نوازش سے ملی درد کی دولت
پہلو میں دھڑکتا ہوا دل درد بنا ہے

حسنٰی مسرور

ہاتھ کیا آتا مگر اپنی سی کر لی میں نے
شیشۂ دل میں وہ مہتاب اتارا تو سہی

ترے بغیر کہاں زندگی گزرتی تھی
بچھڑ کے تجھ سے تجھے سوچنے میں گزری ہے

بلقیس ظفیر الحسن

ہر سمت فروزاں ہیں خد وخال تمھارے
یوں آئینہ خانے پہ جمال آنے لگا ہے

اسے تو مجھ سے بچھڑ کر بھی مل گئی منزل
میں فاصلوں کی طرح کھو گئی فضاؤں میں

عرفانہ عزیز

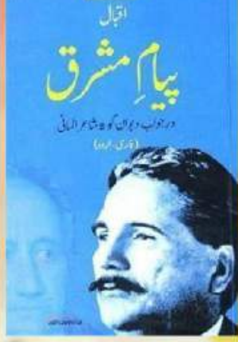

ڈاکٹر رئیسہ پروین

اقبال اور پیامِ مشرق

ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی رائے ہے کہ اگر کوئی شاعر سامعین کی ایک بڑی تعداد کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرلے تو یہ اس کی عظمت کی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ نئی بات کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے وقت اور توجہ درکار ہوتی ہے۔ بڑا شاعر وہ ہے، جس کے سامعین کا حلقہ شروع میں خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو لیکن آہستہ آہستہ بڑھتا اور پھیلتا جائے۔ اس کے قدرداں ہر نسل اور زمانے میں موجود ہوں اور دن بہ دن ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے۔ یہی فنکار اور فن کی زندگی کی دلیل ہے۔ اس کی اچھی مثال ذوق اور غالب سے دی جاسکتی ہے۔ ذوق جب شعر سناتے تھے تو دادو تحسین کا غلغلہ بلند ہوجاتا تھا۔ کیونکہ ان کی بات سمجھنے میں سامعین کو دقت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس غالب کا کلام سن کر لوگ سر کھجانے لگتے تھے۔ کوئی سمجھتا تھا اور کوئی نہیں سمجھ پاتا تھا۔ یہی مسئلہ اقبال کے ساتھ بھی درپیش رہا۔ قوم نے ان کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کچھ ناقدین نے ان کے پیغام کو یہ کہہ کر رد کردیا کہ یہ ایک قوم کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا سرچشمہ چونکہ قرآن ہے اور اس کی اساس دین پر قائم ہے اس لیے یہ تمام دنیا کے لوگوں کے لیے لائق عمل نہیں۔ عام انسان نے نہ ان کے پیغام کو پڑھنے کی زحمت گوارا کی اور نہ ہی اس تک رسائی حاصل کرنے کی سعی ،اقبال کو اردو ادب کے ایک شاعر کی حیثیت سے پڑھا جاتا رہا ہے۔ کچھ دیر کے لیے ان کے اشعار دلوں کو چھو جاتے ہیں اور دلوں میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کر جاتے ہیں۔

اقبال کے کلام میں بات کو بار بار اور متنوع انداز میں متنوع شخصیات کے حوالے سے سمجھانے کی سعی مسلسل ملتی ہے۔ اس کی خاص وجہ غالباً یہ ہے کہ جہاں پیغام دینا مقصود ہو اور بنی نوع انسان کی اصلاح کی بات کی جائے وہاں اپنے مقصد اور اپنی بات کو بار بار دہرانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اصلاحِ عام کے لیے کسی صالح عمل کو براہِ راست کہنے سے وہ اثر پیدا نہیں ہوتا جو علامتوں اور استعاروں کے پردے میں سمجھانے سے ہوتا ہے خاص طور پر ایسے ماحول میں جہاں زبانوں پہ تالے ہوں اور انسانی فطرت میں کاہلی اور جمود طاری ہو۔ وہاں مسلسل ضرب لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کی تمام تصانیف خواہ وہ فارسی زبان کی ہوں یا اردو زبان سے تعلق رکھتی ہوں سبھی میں اقبال نے اپنے پیغام کو سو سو طرح سے بیان کیا ہے تا کہ اس سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر کے ان کے اذہان کو عمل و حرکت کے لیے آمادہ کیا جاسکے اور وہ اپنے حالات کو بدلنے اور زندگیوں کو سنوارنے کی سعی مسلسل میں سرگرداں ہوجائیں، ان کے ذہن کشادہ اور روشن ہوجائیں۔ اس کے لیے انھوں نے قرآن شریف اور پیغمبرانِ دین کی زندگیوں سے پورا پورا استفادہ کیا اس کے ساتھ ہر اس

شخصیت کو اجاگر کیا جو ان کے پیغام کے لیے مفید ثابت ہوسکتی تھی۔

آج کا دور کم و بیش اسی طرح کے حالات سے دوچار ہے جیسا کہ آج سے سو سال پہلے تھا۔ معاشرے میں عدم اطمینان، لاقانونیت، افراتفری، ناآسودگی، نامرادی کی فضا تمام عالم کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ خاص طور پر مسلم ممالک کے حالات نہایت پیچیدہ اور تشویش ناک حد تک خراب ہو چکے ہیں۔ اس کی خاص وجہ دین سے لاتعلق ہو کر دنیا کو سنوارنا ان کا مقصد اولین ہے۔ انسان کے ایک سمت جھکاؤ نے اس کو مادیت پرست بنا دیا ہے۔ خدا نے انسان کو اس سرزمین پر کس مقصد کے لیے بھیجا تھا وہ یہ بھول چکے ہیں۔ جو عناصر انسان کی بنیادوں کو مضبوطی اور بلندی عطا کرتے ہیں۔ وہ مذہبی پختگی، کچھ کر گزرنے کا حوصلہ، اعلیٰ نصب العین اور اس کے لیے جدوجہد، صالح خیالات، بنی نوع انسان سے محبت یہی جذبے کامیابی اور سربلندی کے ضامن ہیں۔ اقبال نے اپنے تمام کلام کے ذریعہ اس بات کی تعلیم دی ہے ان کا کہنا ہے کہ مومن کی زندگی اطاعت، طہارت، عبادت، سخت محنت اور جدوجہد سے عبارت ہے۔ آج کے منظر نامہ میں اقبال کے کلام اور پیغام کی ضرورت اور اہمیت ویسی ہی ہے جیسی کی اقبال کے دور میں تھی۔ ان کا کلام آج بھی افادیت اور معالج کا کام سرانجام دے سکتا ہے، بہ شرط کہ آج کے اسلامی ممالک اور عوام غور و فکر کو اپنا شیوۂ اولین بنالیں اور اپنے حالات کے تئیں بیدار ہو جائیں۔ دنیا کے حالات اور تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اقبال کے کلام کی اہمیت اس دور میں پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

ان کے اشعار ان کے شدت احساس اور عمیق مطالعہ کے غماز ہیں۔ ان کا وژن نہایت وسیع اور گہرا ہے اقبال نے سطحی خیالات و جذبات سے پرہیز کیا ہے۔ وہ دل میں اتر کر بات کہنے کے قائل ہیں۔ اس حیات و کائنات کو انھوں نے قرآن و شریعت کے تناظر میں دیکھا اور پرکھا ہے کیونکہ یہ ایک یہی لائحہ عمل ہے جو انسان کے درد و مصیبتوں کا مداوا کر سکتا ہے۔ اسی پیغام کو انھوں نے اپنی فارسی تصنیف ''پیام مشرق'' میں بھی عام کیا ہے۔

زیر بحث موضوع اقبال کی تصنیف ''پیام مشرق'' کا دیباچہ ہے جس کو اقبال نے والئی افغانستان امیر امان اللہ خاں سے منسوب کیا تھا۔ یہ دیباچہ آج بھی ہر قوم اور ہر حاکم کے لیے کیمیا کی حیثیت رکھتا ہے اس دیباچہ میں اقبال نے امیر امان اللہ خاں کو جن قیمتی اور نایاب مشوروں سے نوازا ہے یہ ایسے جواہر ریزے ہیں جن کو اپنا کر ہر حاکم ایک بہتر حکومت کی داغ بیل ڈال سکتا ہے۔ اقبال نے یہ کتاب جرمن حکیم و فلسفی گوئٹے کی غیر فانی تصنیف ''پیام مغرب'' کے جواب میں لکھی تھی۔ ان تصنیفات کے لکھنے کے پیچھے دونوں حضرات کا مقصد اخلاقی، ملی اور مذہبی حقائق کو قاری کے گوش گذار کرنا تھا۔ ان تمام محرکات کا تعلق انسانی زندگی اور قوموں کی باطنی تربیت سے گہرا ہے۔ باطنی تربیت سے اقبال کی مراد انسانوں کو اس طرف مائل کرنا تھا جہاں اس کی ذہنی تربیت گاہ کے لیے نہایت موثر طریقہ کار موجود ہیں۔ وہ ہے قرآن اور شریعت کیونکہ یہی ایک واحد طریقہ ہے جو انسان کی باطنی تربیت کے لیے کارگر ثابت ہوسکتا ہے۔

اقبال کو 1905 میں یورپ جانے کا موقع ملا وہاں انھوں نے مغربی تہذیب کے مضر اثرات کا گہرائی سے مشاہدہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اہل یورپ جس تہذیب پر فخر کرتے ہیں اس کی بنیاد مادیت پرستی اور الحاد پر قائم ہے۔ یہ وہ عناصر ہیں جو زندگی کی دوڑ میں انسان کا بہت دور تک ساتھ نہیں دے سکتے۔ انسان کے ذہن میں اگر یہ بات گھر کر جائے کہ وہ محض ایک مادی تلازمہ ہے۔ اس کا نہ کوئی پیدا کرنے والا ہے نہ اس پر کوئی حاکم ہے اور نہ دوبارہ زندہ کیے جانے کا یقین ہو اور نہ ہی روز حساب خدا کے سامنے پیش ہونے کا تصور ہو تو ایسے میں کوئی طاقت اس کو نیکی کی طرف مائل نہیں کر سکتی۔ ان نظریات کے پیش نظر وہ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کے اہل بھی نہیں رہ جائے گا۔ معاشرے کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے انسان کے ان نظریات پر قدغن لگانا ضروری ہے۔ 1936 میں اقبال نے یہ پیشین گوئی کر دی تھی کہ یورپ کا نظامِ حکومت چونکہ مادیت اور لادینیت پر قائم ہے اس لیے اس کی تباہی یقینی ہے۔

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

مغرب کی مادہ پرستی نے ظاہری چکاچوند تو پیدا کر لی لیکن اس میں قلب و روح کو گرمانے کی طاقت ناپید تھی اس کی خاص وجہ روحانیت اور عشق کی کمی تھی اس لیے اقبال نے ''پیام مشرق'' کے ذریعے مشرق اور مغرب کو عشق کا پیغام دیا۔ چونکہ ایک بڑا ذہن اپنے زمانے سے آگے کا ادراک رکھتا ہے اور جو محرکات عام اذہان کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں اُس تک اس کی رسائی ہوتی ہے۔

یورپ کی جنگِ عظیم کو اقبال قیامت خیز عمل سے تعبیر کرتے ہیں جس نے پرانی دنیا کو نیست و نابود کر کے اس کی خاک سے ایک نئے آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا کی تعمیر کی۔ یورپ کے قدامت پرست کوتاہ نظر مفکرین اس تبدیلی کا اندازہ پیش از وقت نہ لگا سکے حالانکہ وہ اس وقت انسانی ضمیر میں کارفرما تھا لیکن قدامت پرستی نے ان کی توجہ اس

طرف مرکوز ہونے نہیں دی۔

ترکوں کے عروج وزوال کے بعد اسلامی ممالک صدیوں کی نیند سے جاگے اور یورپ کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہوگئے۔ ایران، عراق ، فلسطین ،شام ، مصر، سوڈان ،طرابلس ، مراقش، الجیریا، ٹیونس غرض تمام مسلم ممالک غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی سعی کرنے لگے۔ ان سماجی ،سیاسی اور معاشی حالات کی روشنی میں جب اقبال کے دیباچہ کا مطالعہ کرتے ہیں جو انھوں نے امیر امان اللہ خاں فرماں روائے دولتِ مستقلہٗ افغانستان کو ایک پیغام کی شکل میں ارسال کیا تھا۔ جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کا دل تمام بنی نوع انسان کی تباہی اور بربادی پر فکر مند تھا۔ خاص طور پر وہ مسلم قوم کو بے حسی اور تباہی سے بچانے پر مصر تھے۔ دیباچہ میں اقبال نے نہایت گراں قدر مشوروں اور معلومات سے امیر کو آگاہ کیا ہے۔ امیر امان اللہ خاں اگر اقبال کے اس دیباچہ پر غور وخوض کرتے اور اس پر سنجیدگی سے عمل پیرا ہوتے تو شاید آج افغانستان کی تاریخ کسی اور طرح رقم کی جاتی۔

پیام مشرق کا سالِ تصنیف 1918 سے شروع ہوکر 1933 تک ختم ہوتا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ سات بندوں پر مشتمل ایسا فرمان ہے جو قوم کے حق میں کیمیا کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے بند میں اقبال امیر امان اللہ کی ذہانت ودانائی ،عزم وہمت کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیری آنکھ پوشیدہ امور کو دیکھنے کی قوت رکھتی ہے تجھ میں وہ صلاحیت موجود ہے جو افغانی قوم کا مستقبل سنوارنے میں معاون ثابت ہوگی، دوسرے بند میں اقبال جرمن شاعر گوئٹے سے اپنا موازنہ پیش کرتے ہیں۔ اپنے اور گوئٹے کی خودشناسی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا نے گوئٹے اور مجھے اپنے فضل وکرم سے زندگی کی ان حقیقتوں سے آگاہ کیا ہے جہاں عام انسان کی رسائی نہیں اس لیے میں اس جستجو میں رہتا ہوں کہ میرے علم وہنر سے میری قوم فیض یاب ہوسکے اس ضمن میں اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کی حقیقت عشق میں پوشیدہ ہے۔ اگر انسان شیوۂ عشق اختیار کرلے تو زندگی میں سربلندی اور کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ اس لیے وہ عشق کے جذبے کو عام کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں کہ ’’پیام مغرب‘‘ میں گوئٹے نے مغربی حکماء کا تتبع کیا ہے اور ’’پیام مشرق‘‘ میں، میں نے مشرقی خیالات سے خوشہ چینی کی ہے اقبال اس بات پر کفِ افسوس ملتے ہیں کہ گوئٹے کی خوش نصیبی تھی کہ اسے ایک ترقی یافتہ، آزادخو، سربلند اور تعلیم یافتہ قوم سے خطاب تھا۔ اس لیے اس کی قوم نے اس کے پیغام کو اہمیت دی اور اس کی قدر ومنزلت کی۔ جبکہ اقبال کی مخاطب ایک ایسی قوم تھی جو غلامی پہ رضامند ہے اور جہالت کا شکار ہے۔ جس میں اقبال کے پیام کی روح تک رسائی حاصل کرنے کی اہلیت نہیں۔ آگے چل کر اقبال کہتے ہیں کہ میں اور گوئٹے اس کائنات اور زندگی کے اسرار ورموز سے کماحقہ آگاہی رکھتے ہیں۔ اس لیے بنی نوع انسان کو زندگی اور عشق کا پیغام دیتے ہیں البتہ دونوں دانشوروں کے ماحول کی تبدیلی کی بناپر اس پیغام کی نوعیت مختلف ہے۔

اقبال کو اس بات کا دکھ ہے کہ ان کی قوم ان کے پیام کی قدر نہیں کرتی نہ ہی ان کے کلام کی افادیت، اور حکیمانہ نکات کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ حالانکہ اقبال نے اپنے اشعار کے ذریعے دنیا کو سروری، بلندی اور کامیابی سے ہمکنار ہونے کے طریقے بتائے ہیں۔ اقبال کا کہنا تھا کہ یہ لوگ میرے اشعار میں رموزِ حیات کی نشاندہی کرنے کے بجائے انھیں اشعار کی طرح پڑھتے ہیں۔ میرے بلند خیالات اور کیمیا پیام پر عمل پیرا ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ خدا نے اقبال کو اپنے فضل وکرم سے دین وسیاست کے حقائق ورموز سے پوری آگاہی عطا کی تھی۔ لیکن قوم نے ان کے کلام کی وہ قدر ومنزلت نہیں کی جس کے اقبال مستحق تھے۔ اقبال کو اس بات کا افسوس تھا کہ انھیں ایسے ملک میں پیدا کیا گیا جس کے بندے فرسودہ روایات کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ ضربِ کلیم میں کہتے ہیں۔

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضا مند

عرب یعنی وادی بطحا کے باشندے جن کے گھروں میں اسلام پیدا ہوا تھا، آج ان کی حالت یہ ہے کہ اسلامی اصولوں سے قطعاً نابلد ہوچکے ہیں ان کے سینوں میں اللہ اور رسول سے محبت کی آگ سرد پڑ چکی ہے۔ اس ضمن میں اقبال اس واقع کی طرف اشارہ کرتے ہیں جب 17-1916 میں عربوں نے ترکوں کے خلاف مورچہ سنبھالا۔ وہ ترک قوم، جس نے چارسو سال اپنے خون سے حجاز کی سرزمین کی آبیاری کی تھی اور اپنے آپ کو خادم حرمین شریفین کہنے پر فخر کیا کرتے تھے۔ عربوں نے انگریزوں سے مل کر اپنے ان بھائیوں اور محسنوں کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کرنے میں دریغ نہیں کیا۔

آج اسلامی ممالک کا حال یہ ہے کہ وہ انگریزوں کے زیرِ نگیں ہوکر رہ گئے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ آج کے مسلمانوں میں نہ حضرت خالدؓ کی سی شجاعت باقی ہے نہ حضرت فاروقؓ کی شانِ استغنا اور انصاف پسندی، نہ ابوایوب انصاریؓ کا سا جذبہ جہاد باقی ہے۔ ایسے حالات میں اقبال کو والیِ افغانستان امیر امان اللہ سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں امان اللہ کا جوش

ولولہ اور بلند نصب العین دیکھ کر اقبال کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ ان میں حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ کا سا عزم و استقلال پایا جاتا ہے ان میں ان معتبر حضرات کے نقش قدم پر چلنے کی سعادت بھی موجود ہے۔

اقبال امیر کو ان کی قوم کی نااہلیت سے روبہ رو کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ عرصہ دراز سے افغانی غیر منظم اور منتشر رہے ہیں۔اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہ قوم ہمیشہ کسی نہ کسی ملک کے زیر نگیں پھنسے رہنے کی وجہ سے اپنی صلاحیتوں کا صحیح ادراک حاصل نہ کرسکی اس لیے علم و ہنر اور تہذیب و تمدن سے عاری ہو کر رہ گئی۔ان لوگوں کو نہیں معلوم کہ ترقی کس طرح ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہترین فطری صلاحیتیں ہونے کے باوجود افغانی ابھی تک دنیا میں اپنا کوئی خاص مقام پیدا نہ کر سکے۔انھیں دنیا کی نعمتوں سے کچھ حاصل نہ ہوسکا وہ برسوں سے ان کوہستانوں میں خلوت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔یہ لوگ کشمکش حیات سے بیگانہ ہیں اس لیے جہاں سینکڑوں سال پہلے تھے آج بھی وہ وہیں کھڑے ہیں،آج بھی وہ غیر مہذب اور انتشار کا شکار ہیں،آج بھی ان کے گھر علم و فن سے عاری ہیں،یہ ترقی اور آسودگی کے اصولوں سے ناآشنا ہیں۔لہٰذا نہ یہ دنیا سے واقف ہیں اور نہ دنیا والے ان سے واقف ہو پائے۔ان کی زندگیاں آگے بڑھنے کی اہل نہیں ہیں۔

آگے چل کر اقبال نہایت باریک اور بہت ہی قیمتی حقائق و معارف بیان کرتے ہیں،جس کا سرچشمہ قرآن اور اس کی آیات ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ آفاق و نفس سے آگاہی حاصل کرے۔یہاں علم نفس سے مراد فلسفہ اور علم آفاق سے مراد سائنس ہے۔قرآن شریف اس طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔

سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم

ترجمہ:''عنقریب دکھائیں گے ہم ان کو اپنی نشانیاں کائنات میں اور خود ان کے نفوس میں۔''

قرآن شریف اور اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ زندگی میں وہی قوم بہرہ مند ہوسکتی ہے جو علم آفاق اور علم انفس کے حصول کے لیے جدوجہد کرے گی۔کیونکہ انسانی وجود میں وہ تمام کمالاتِ زندگی اور جوہر پائے جاتے ہیں جو انسان کو اشرف المخلوقات کے درجہ پر پہنچا دیتے ہیں۔یہ تب تک ظاہر نہیں ہوتے جب تک انسان اپنی خودی کو نہ پہچانے۔ خدا نے انسان کو پانی، ہوا روشنی اور زمین مفت فراہم کی ہے،لیکن جو ہر و کمالات سب کو نہیں ملے،ان کمالات و ہنر کو انسان اپنی محنت اور جدوجہد کی بدولت خود پیدا کرتا ہے۔یعنی کمالات زندگی کی لذتوں سے مستفید ہونے کا حق انسان کو خدا نے پیدائشی طور پر عطا نہیں کیا۔بلکہ اس کے لیے سعی مسلسل سخت محنت درکار ہوتی ہے۔اقبال نے اپنے کلام کے ذریعے اس بات کی پرزور الفاظ میں تائید کی ہے کہ زندگی کے کمالات سے وہی شخص بہرہ مند ہوسکتا ہے جو ان کمالات کے حصول کے لیے جدوجہد کرے گا۔اس کے لیے اقبال نے یہ طریقہ تجویز کیا کہ انسان کو آفاق اور نفس سے پوری واقفیت حاصل کرنی چاہیے کیونکہ انسان کی مادی ترقی انھیں دو چیزوں پر منحصر ہے۔

آفاق اور نفس کا تعلق خدا کی قدرت کی پوشیدہ نشانیوں میں سے ایک ہے۔اس لیے اسلام ان دونوں کے مطالعہ کی تلقین کرتا ہے۔تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جن قوموں نے ان علوم کا انہماک سے مطالعہ کیا، انھیں زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی حاصل ہوئی۔ آج اسی ترقی کی بنیاد پر یورپ نے تمام عالم اسلام کو سیاسی معاشی اور ذہنی اعتبار سے اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ایک وہ وقت تھا جب مسلمان تمام دنیا پر قابض تھے۔غرناطہ اور قرطبہ کی تعلیم گاہوں میں جرمنی،اٹلی، فرانس اور انگلستان کے طلبہ مسلمانوں سے سائنس اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔لیکن جب پانچویں صدی ہجری میں دین اسلام میں مختلف غیر اسلامی عناصر جگہ پانے لگے مثلاً یہودیت، مجوسیت، عجمیت، لاادویت، رہبانیت، زندیقیت وغیرہ نے اسلامی روح کو جکڑنا شروع کردیا تو رفتہ رفتہ یہ ترقی ماند پڑتی گئی۔حرکت و عمل سے بھرپور انقلاب آفریں نظام حیات مردہ اور جامد ہو کر رہ گیا۔یہی بے حسی اور جمود کا عالم آج بھی تمام اسلامی قوم کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔

آج کا دور جدیدیت کا دور ہے اس لیے اس کے تقاضے بھی مختلف نوعیت کے ہیں۔لیکن قرآن کا فرمان ہر دور اور ہر انسان کے لیے سودمند ثابت ہوتا ہے۔قرآن سائنس یعنی علم آفاق اور علم نفس یعنی فلسفہ پر زور دیتا ہے۔مسلم ممالک ان دونوں پہلو میں بالکل پیچھے ہیں،ان کے اذہان میں غالباً اس بات نے گھر کر رکھا ہے کہ سائنسی علوم کو اپنانا ایسا ہے جیسے مذہب سے دوری اس سوچ نے تمام عالم اسلام کو برباد کردیا ہے۔حالانکہ وہ تمام جدید چیزوں کو اپنانے میں پیش پیش ہیں لیکن سائنسی علوم کو سیکھنے کی طرف ان کی ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔قرآن بار بار اس بات کی تنبیہ کرتا ہے کہ قرآن کی آیات کو سمجھ سمجھ کر اور غور و فکر سے پڑھو ہم نے (خدا) نے زمینوں اور آسمانوں میں وہ وہ راز پوشیدہ کئے ہیں جو عقل مند ہوں گے اور جن کا مشاہدہ گہرا ہوگا وہی اس راز کو پائیں گے۔دوسری قومیں اس نکتہ کے سہارے آگے بڑھیں اور آج انھوں نے زمین و آسمان کے اسرار و رموز

کو آشکارا کر دکھایا ہے جس کے عوض سر بلندی اور عظمت حاصل کر لی ہے یہی انسان کی معراج ہے جس تک مسلم قوم کی رسائی نہیں ہے۔

اقبال نے قرآن کی روشنی میں علم النفس یعنی انسانی وجود کے مطالعہ کا خلاصہ پیش کیا ان کا کہنا ہے کہ علم النفس علم معیشت کے ساتھ علم اخلاق کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور علم آفاق کا مطالعہ، علم حیات، طبعیات اور کیمیائی علوم کی ترقی کا پیش خیمہ بنتا ہے مسلمانوں کی ماضی میں اور یورپ کی موجودہ ترقی کا راز انھیں علوم میں پوشیدہ ہے۔ اقبال امیر امان اللہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حکمت یعنی سائنس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں اسے خیر کثیر سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی بڑی بھلائی۔

من یوت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا

مندرجہ بالا آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے لیے علم و حکمت سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس لیے اے امیر امان اللہ اپنی قوم کو زیور علم وحکمت سے آراستہ کیجئے تا کہ وہ اس دنیا میں سرخرو اور کامیاب وکامرانی حاصل کر سکیں۔ ان علوم کو اپنا کر انھیں اس بات کا اندازہ ہوگا کہ انسانی وجود کی کس قدر اہمیت اور قدر ومنزلت متعین کی گئی ہے اور کس کس طرح کی صلاحیتوں سے انسانی وجود کو آراستہ کیا گیا ہے۔ انسان میں دنیا کی تمام اشیاء کو اپنے مطابق مسخر کرنے کی قوت بدرجہ اتم موجود ہے وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر بڑی سے بڑی مہم سر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس لیے خدا نے اسے اشرف المخلوقات کے لقب سے نوازا ہے تمام کائنات میں انسان سب سے اعلیٰ اور افضل مرتبے پر فائز ہے۔ کائناتی علوم اور فطرت سے آگاہی ہی انسان میں اس اعلیٰ جذبہ کو پیدا کرتی ہے جس کے ذریعے وہ تمام خطرات اور مشکلات کو سر کر کے کندن بن جاتا ہے اور قدرت کے اسرار ورموز کے دریا میں ڈوب کر اس کی تہہ سے گوہر نایاب نکال لانے پر قادر ہے۔ اس کی سب سے اعلیٰ ترین مثال یہ ہے کہ جب فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ تو نے آدم کے بجائے ہمیں خلیفہ ارض کیوں نہیں بنایا، ہم تیرے فرمانبردار اور مطیع ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد کیا کہ آدم تم سے افضل ہے کیونکہ اس میں کائنات کی اشیاء کے خواص دریافت کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور تم (فرشتے) اس صلاحیت سے محروم ہو۔ یہاں اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ انسان کا رتبہ فرشتوں سے افضل ہے کیونکہ اس میں ترقی کرنے کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ آج اسی انسان نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس دنیا کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے جس کے لیے کڑی محنت اور مشقت درکار تھی۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

دنیا کی اشیاء کے علم کے سلسلے میں اقبال قرآن شریف کی اس آیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

وعلم آدم الاسماء کلھا

ترجمہ: ہم نے آدم کو کائنات کی تمام اشیاء کے نام سکھا دیے۔

یہاں اسماء سے اشیاء کے خصائل کا علم مراد ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے امیر اگر آپ اس غیور قوم کی تعلیم وتربیت کی کوشش کریں گے تو یہ امت مسلمہ پر ایک بہت بڑا احسان ہوگا آپ انھیں دنیا اور کائنات کے علوم سے بہرہ مند ہونے کے ذرائع فراہم کریں۔

سائنس ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے انسان دنیاوی معجزات دکھا سکتا ہے، جیسا کہ یورپی ممالک دکھا رہے ہیں۔ انھوں نے سائنسی ایجادات کی بدولت طرح طرح کے راز آشکارا کیے۔ اس کے برعکس سائنس سے غیر دلچسپی اور غیر جانب داری کی وجہ سے عرب اور دوسرے اسلامی ممالک اپنے ملکوں کی دولت اور معدنیات سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا پا رہے ہیں بلکہ وہ ہر گام پر یورپ کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسی لیے ان ممالک کی ترقی تھم سی گئی اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ مسلم قوم سائنس سے بیگانہ محض ہو چکی ہے وہ اس راز سے واقف نہیں کہ جو قومیں سائنس اور ٹیکنالوجی میں اپنا دھیان مرکوز کرتی ہیں وہ مٹی سے سونا نکالنے کا ہنر جانتی ہیں۔ Advance ٹیکنالوجی کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلم ممالک اپنے ملکوں میں دستیاب تیل اور سونے وغیرہ جیسی معدنیات سے خود فائدہ نہیں اٹھا پاتے بلکہ اس کے لیے انھیں یورپ کی مدد درکار ہوتی ہے وہ ان کاموں کے عوض مسلم ممالک کی دولت کو اپنے ملکوں میں منتقل کرتے ہیں، جس نے ان کی معیشت کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا کر دی ہے۔ اس لیے اے امیر آپ افغانیوں کو سائنسی اور علم نفس کی طرف راغب کیجیے تبھی ان کی ترقی اور خوش حالی ممکن ہو سکے گی۔

جب تک انسان کے ضمیر میں انقلاب کی آرزو، تمنا اور چاہت پیدا نہیں ہوگی اور وہ اس کے حصول کے لیے مشقت اور جدوجہد کا جذبہ اپنے اندر پیدا نہیں کرے گا تب تک انقلاب کا ظہور عمل میں نہیں آسکتا۔ قرآن بار بار اس طرف اشارہ کرتا ہے۔

ان اللہ لا یغیر مابقوم حتی یغیروا ما بانفسھم

ترجمہ: ''جب تک کوئی قوم اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں تبدیلی یا انقلاب پیدا نہ کرے اس وقت تک اللہ تعالیٰ بھی اس قوم کی ظاہری حالت

میں کوئی تبدیلی یا انقلاب پیدا نہیں کیا کرتا۔''

آگے چل کر اقبال امان اللہ خاں کو اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ انھیں اپنی سلطنت کی بنیادوں کو بھی مضبوط کرنا چاہیے۔ اس کے لیے چند قیمتی مشوروں پر عمل کرنا ضروری ہے، پہلے یہ کہ آپ یعنی امیر کو مردم شناس ہونا چاہیے دنیا میں مختلف طرح کے انسان پائے جاتے ہیں۔ آپ کو ایسے لوگوں کی پہچان کرنی ہوگی اور اپنی حکومت کے امور کے لیے ایسے حضرات کا انتخاب کرنا ہوگا جو نیک سیرت، ذہین اور دانشوری میں کمال رکھتے ہوں تبھی آپ کی حکومت کو استحکام حاصل ہو سکتا ہے۔

اقبال امیر کو اس بات کی خاص تائید کرتے ہیں کہ حکمراں کو اپنے مشیروں کا انتخاب نہایت سمجھداری اور دوراندیشی سے کرنا چاہیے۔ کیونکہ حکمراں کی حکمت عملی کا دار و مدار مشیروں اور مصاحب پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر آپ نے سرکاری امور کے لیے نااہل اور بے وقوف لوگوں کا انتخاب کر لیا تو ان کے مشورے بھی ان کی اہلیت کے حساب سے اسی طرح کے ہوں گے لہٰذا ان کے غلط مشوروں پر عمل کر کے جو نتائج برآمد ہوں گے وہ تمام ملک کے لیے نہایت مضر اور خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لیے مصاحب قابل اور دانا ہونے چاہیے ایسے ہی مشیر حکومت کے لیے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی میں کارآمد ثابت ہوتے ہیں اور حکمرانوں کے تاج و تخت کو جلا بخشتے ہیں اس لیے آپ اس طرف خاص توجہ کیجئے۔

قابل مشیروں کے ساتھ ساتھ حکمرانوں میں بھی وہ ساری صفات کا ہونا ضروری ہے جس کی بدولت حکومت کو عظمت اور سربلندی عطا ہوتی ہے اس کی اعلیٰ ترین مثال حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ کی حکمت عملی ہے۔ حکمراں کو چاہیے کہ وہ حضرت عمرؓ جیسا منصف مزاج اور قوم کا ہمدرد ہو اور حضرت علیؓ کا سا فقر اور علم سے مالا مال ہو۔ اگر کسی حکمراں میں یہ صفات موجود نہیں تو وہ اسلامی رو سے حکومت کرنے کے اہل نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں اقبال امیر کو مشورہ دیتے ہیں کہ انھیں خلوت میں بیٹھ کر احتسابِ نفس کرنا چاہیے، تاکہ اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ آپ کے اندر خوبیاں کس حد تک پائی جاتی ہیں۔ جو شخص نفس امارہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا وہ دنیا میں عظمت اور بلندی حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ افغانیوں کی اصلاح چاہتے ہیں تو پہلے اپنی اصلاح کی طرف توجہ مرکوز کریں۔ ایک حاکم میں شانِ بادشاہی کے ساتھ شان درویشی کا ہونا بھی ضروری ہے کسی بھی کام کو انجام دیتے ہوئے خدا کی رضا اور اس کے احکام کو مدنظر رکھنا ضروری امر ہے، اس کی سب سے اچھی مثال اقبال سلطان مراد کی زندگی سے دیتے ہیں جو بادشاہ اردشیر کی شان و شوکت کے ساتھ زرغفاریؓ کی شانِ فقر سے بھی مالا مال تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جن حکمرانوں نے دنیائے اسلام میں عزت و کامیابی حاصل کی ان کے پیچھے یہی عوامل کارفرما تھے۔ مثلاً ٹیپو سلطان اورنگ زیب سلطان نورالدین زنگی، سلطان محمود بیگڑہ وغیرہ۔ ان سبھی حکمرانوں میں شان خسروی کے ساتھ ساتھ فقر اور فکر کی شان بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ ان سبھی کے مدّمقابل حضرت سلمان فارسیؓ کی زندگی تھی جن کی کل کائنات صرف دو چیزوں پر مشتمل تھی پہلی قرآن شریف، دوسری تلوار۔ اس کے علاوہ حضرت سلمانؓ کے گھر میں کوئی ساز و سامان نہیں تھا۔ حالانکہ وہ والئی ملک تھے۔ تو اے امان اللہ خاں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جو مسلمان رسول کا عاشق ہوگا اس کے پاس کوئی ساز و سامان نہیں ملے گا لیکن وہ دنیا پر حکمرانی کرے گا۔ اگر اور مثالیں درکار ہیں تو سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز اجمیریؒ حضرت بوعلیؒ قلندر پانی پتی، حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ حضرت سید بندہ نواز گیسو دراز وغیرہ کی زندگیاں ہمارے سامنے ہیں۔ اس لیے اے امیر آپ ہمیشہ خدا سے یہ دعا کیا کریں کہ وہ آپ کو حضرت صدیقؓ اور حضرت علیؓ کا سا سوز و گداز اور عشق رسول کا جذبہ عطا فرمائے تبھی آپ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکیں گے۔

آخری بند میں اقبال امیر امان اللہ کو کامیابی کا راز بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ دین پر چل کر ہی انسان کامرانی اور شادمانی حاصل کر سکتا ہے اس کی سب سے اچھی مثال ترکی حکمراں ہیں، جنھوں نے دین اور دنیا کو ساتھ رکھا اور اپنی عقلمندی اور قابل مشیروں کی وجہ سے تقریباً چار سو سال تک تمام دنیا پر اپنا پرچم لہرایا اے امیر آپ بھی عشقِ خدا اور عشقِ رسول اختیار کیجئے اور اپنی قوم کو بھی اس نعمت سے سرفراز کیجیے۔ یہاں دیباچہ کا اختتام ہوتا ہے۔

جو مشورے اقبال نے امیر امان اللہ کو دیئے اس کی روشنی میں کوئی بھی حاکم خواہ وہ کسی بھی قوم سے تعلق رکھتا ہوا گر ان مشوروں کو اپنائے گا تو اس کے لیے دنیا اور آخرت میں سرخرو ہونے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ مندرجہ بالا مشورے آج کے منظرنامے پر بھی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ قوموں کا عروج و زوال اسی پر موقوف ہے۔

□□□

Dr. Raisa Parveen
934, Kucha Rohilla Khan
Tiraha Bahram Khan, Darya Ganj
New Delhi-110002

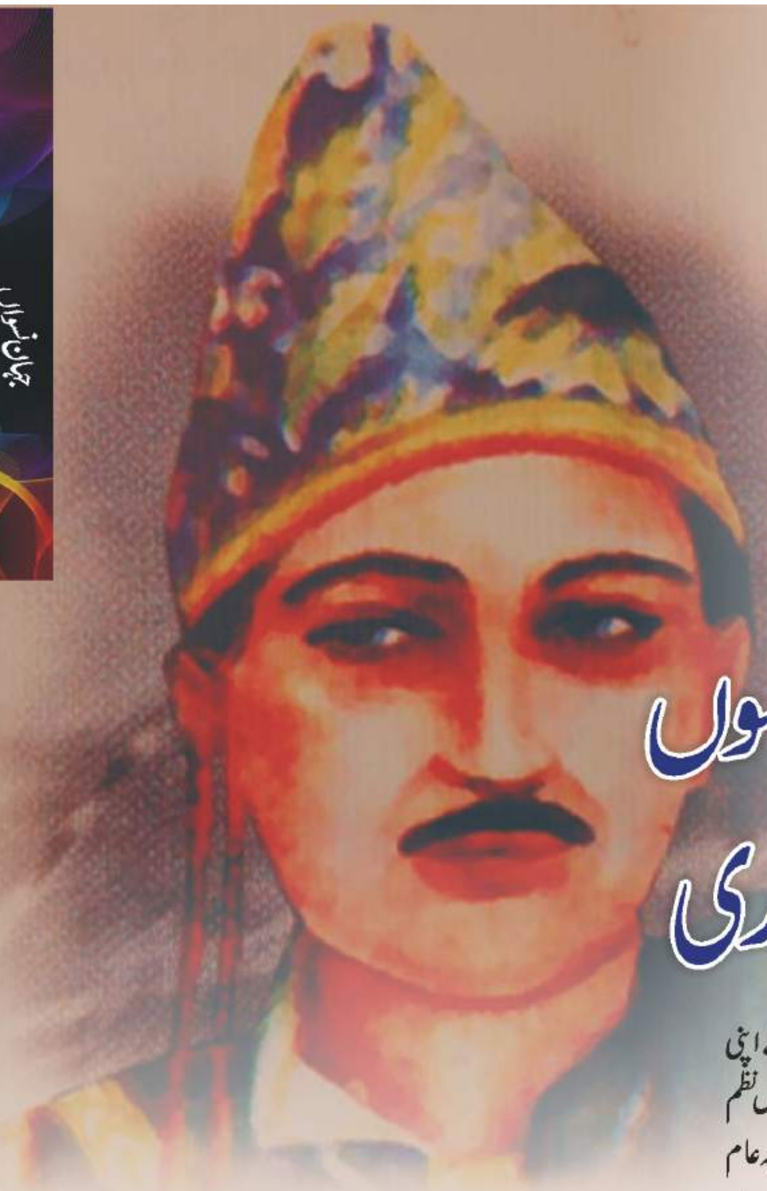

ڈاکٹر فریدہ بیگم

نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں جزئیات نگاری

اردو شاعری میں نظیر اکبرآبادی وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ جداگانہ راستہ منتخب کر کے منفرد مقام بنایا۔ انھیں نظم نگاری میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ عام انسانی زندگی کے مسائل و معاملات کو موضوع بحث بنایا اور اپنے فن پاروں کے ذریعہ اسے حل کرنے کی کوشش کی۔ عدم مساوات کی حد بندیوں اور اس کے مسائل کا حل خوبصورت دلکش و سہل انداز میں پیش کیا ہے۔ جہاں عوامی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں فنکارانہ انداز میں ابھر کر سامنے آتی ہیں وہیں ہندوستانی تہذیب میں قومی یکجہتی، عدم مساوات، حب الوطنی کو مستقل موضوع سخن بنا کر عام انسانی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اردو شاعری عوامی مسائل کی ان جزئیات نگاری سے واقف نہیں تھی۔ انھوں نے زمانے کے عام رجحان کے برخلاف ایک ایسے طرز سخن کی بنیاد ڈالی گویا اس سے پہلے ادب و شاعری اس سے غیر مانوس تھے۔ اس فطری بلندی خیال کو عوام الناس کے ہر طبقہ میں مقبولیت و شہرت دوام نصیب ہوئی۔ اسی لیے نظیر اکبرآبادی ''عوامی شاعر'' کے نام سے پہچانے جانے لگے۔

مخمور اکبرآبادی رقمطراز ہیں:

''کیا یہ طریقہ کار انسان پر احسان نہیں کہ نظیر نے شعر کی دولت سوسائٹی کے اس طبقے تک پہنچادی جواب تک ہر اعتبار سے نااہل سمجھا جاتا تھا اور اس میں سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی فیضِ سخن ایک بڑی مشہور بات ہے لیکن جس سخن سے صحیح معنی میں فیض پہنچا وہ نظیر ہی کا سخن ہے''۔

نظیر کی نظموں میں جزئیات نگاری کا فن ان کی شاعری پر چھایا ہوا نظر آتا ہے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کے ہر پہلو کو پوری طرح واضح کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

نظیر کی وسیع معلومات اور بے شمار تجربات کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب تفصیلات کی گرہیں ایک ایک کر کے کھلتی جاتی ہیں۔ معمولی سے معمولی جزئیات بھی اپنی رعنائی و دلکشی لئے عیاں ہوتی جاتی ہے۔ متفرق رنگ میں زندگی کی تصویر آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگتی ہے اور قاری اس میں ڈوب جاتا ہے۔ غیر اہم اور معمولی نظر آنے والے معاملات و مسائل اہم اور خاص بن جاتے ہیں جیسے میلوں، ٹھیلوں، موسموں، تیوہاروں،

تقریبوں، پھل، پھول، ترکاریاں، مقابلہ جات، پتنگ بازی، کبوتر بازی، بلبلوں کی لڑائی، گلہری کا بچہ، وغیرہ موضوعات نظیر کے مطالعۂ کائنات میں بلند تخیل کی بہترین دلیل ہیں۔ نظیر کبوتر بازی میں کبوتروں کے اقسام اور چڑیوں کی قسمیں گنواتے ہیں۔

نظیر کی ''حمد'' میں سارے جانور، چرند، پرند، درند خدا کی حمد و ثنا بیان کر رہے ہیں انھوں نے جزئیات کے ذریعہ ایک سماں باندھا ہے۔ حمد کا بند ملاحظہ ہو:

گڑھ پنکھ ، کلنگ اور بار کوئی ، بلگا ، کوئل تیتر
سرخاب ، ترمتی ، زاغ و زغن ،سمرغ اور مبارس
بہری ،لگھڑ ،توتا، مینا ،ہدہد ،شکرے ، باشے تیت
کیا بلبل قمری ، لعل ،بیا، کیا مکھی ، بھنگا اور مچھر
کل عالم تیری یاد کرے تو صاحب سب کا سچا ہے

نیاز فتح پوری نظیر کی جزئیات نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

جزئیات کا مطالعہ اس کا اتنا وسیع ہے کہ کوہ سے لے کر ہر کاہ تک کوئی چیز اس کی نگاہ سے نہیں چھوٹتی اور ''آہنگ شعر'' اتنا زبردست رکھتا ہے کہ ایک غیر متوازن چیز میں بھی وہ بلا کا توازن پیدا کر دیتا ہے''۔

نظیر کسی چیز کی تفصیلات بیان کرتے ہیں تو معمولی سے معمولی جزئیات پر بھی ان کی نظر ہوتی ہے اور اسی کی مناسبت سے زبان و بیان کا التزام کرتے ہیں انھوں نے جس انداز میں ہندوستان کے مختلف موسموں کا تذکرہ کیا ہے ان موسموں میں انسانی جذبات و کوائف کی عکاسی فنکارانہ انداز میں پیش کی ہے۔ قاری کے تصور میں بھی حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے ان کی نظمیں برسات اور پھسلن، برسات کا تماشہ، برسات کی بہاریں، چاندنی، جھڑی، اومس، اندھیری، جاڑے کی بہاریں اور آندھی وغیرہ میں انھوں نے مصوری کا حق ادا کیا ہے نظم ''بہار'' میں الفاظ کی موسیقی اور شعری نغمگی سے ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں کہ قاری لطف و انبساط محسوس کرتا ہے:

باغ میں سبک کو واہ واہ، کیا ہی مزوں کے گھور تھے
طوطی و بگلے، مور تھے، فاختوں کے بھی شور تھے
شوخ پر اپنے زور تھے، اس کے بھی ہم پہ زور تھے
توڑے، کڑے و بور تھے، چھلے بھی پور پور تھے
پار ہمارا چاند تھا ، چاند کے ہم چکو ر تھے
دونوں چکوی، و چکوا تھے، دونوں پتنگ و ڈور تھے
مے کے نشوں کے شور تھے، کپڑے بھی شور شور
تھے بولا رقیب دن دیے، دوڑیو یارو چور تھے

صبح کے ڈر سے ہڑ بڑا ، یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دغا میں آگئے ، مفت بہار لٹ گئی

نظیر نے اپنی شاعری کے ذریعہ انسانی جذبات کی بہترین تصویر کشی کی ہے اس کو اس درجہ حسین و رنگین بنا دیتے ہیں کہ اس کا احساس قاری اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ نظم ''جاڑے'' میں جزئیات سے ایک منظر پیش کیا ہے:

تن ٹھوکر مار پچھاڑا ہو اور دل سے ہوتی کشتی سی
تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو بجتی ہو سب کی بتی سی
ہو شور پھپھو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی کی
کلّے پر کلہ لگ لگ کر چلتی ہو منھ میں چکی سی
ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

نظیر کی نظمیں معلومات کا خزانہ ہیں جو کچھ ان کی نظروں کے سامنے گذر رہا ہوتا ہے اسے ہو بہو نظم کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ موزوں مترنم الفاظ کے ذریعہ جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ موسم برسات کو نہایت دلنشیں پیرائے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

کتنے شراب پی کر ہو مست چھک رہے ہیں
مے کی گلابی آگئے ، پیالے چھلک رہے ہیں
ہوتا ہے ناچ گھر گھر، گھنگر و جھنک رہے ہیں
پڑتا ہے منھ جھڑا جھڑ، طبلے کھڑک رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اور جس صنم کے تن میں جوڑا ہے زعفرانی
گلنار یا گلابی یا زرد سرخ دھانی
کچھ حسن کی چڑھائی اور کچھ نئی جوانی
جھولوں میں جھولتی ہیں اوپر پڑے ہے پانی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اس نظم میں ستر (70) بندوں کے ذریعہ برسات کے ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ اس سے بہتر برسات کی تصویر اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ مولانا عبدالباری آسی رقم طراز ہیں:

''نظیر کی جزئیات نگاری کا یہ عالم ہے کہ ان کو مفصل بیان اور تشریح پسندی کا خوگر بنایا ہے ---- یہ بے تکلف اور بے باکانہ کوئی واقعہ پیش کرتے ہیں تو الفاظ کا ایک موجزن سمندر ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور ہم حیران رہ جاتے ہیں''۔

نظیر کی نظموں میں جمالیاتی پہلو حسن کی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر

ہے۔اپنے تخیل بیان سے حسین مرقع پیش کرتے ہیں۔عورت کے ناز و انداز،زیورولباس کو پری کے پردے میں دوشیزہ کے حسن اوراس کی فطرت کے راز کا انکشاف کیا ہے نظم ''پری کا سراپا'' ملاحظہ ہو۔

خوں ریز کرشمہ، ناز ستم، غزوں کی جھکاوٹ ویسی ہے
مژگاں کی سنا، نظروں کی آنی، ابرو کی لچھاوٹ ویسی ہے
عیار نظر ، مکار ادا، تیوری کی چڑھاوٹ ویسی ہے
قتال نگہ اور دشت غضب، آنکھوں کی لگاوٹ ویسی ہے
پلکوں کی جھپک، پتلی کی پھرت، سرمے کی گھلاوٹ ویسی ہے
وہ کافر دھج جی دیکھ جسے ، سو بار قیامت کا لرزے
پازیب، کڑے، پایل، گھنگرو، کڑیاں، چھڑیاں گجرے توڑے
ہر جنبش میں سو جھنکاریں ، ہر ایک قدم پر سو جھمکے
وہ چنچل چال جوانی کی ، اونچی ایڑی نیچے نیچے
گھنشوں کی کھٹک، دامن کی جھٹک، ٹھوکر کی لگاوٹ ویسی ہے

نظیر نے ہر ہندوستانی تہوار وتقریبات کو وسیع النظری بے تعصبی کی نظر سے دیکھا جو قومی یکجہتی کی بہترین مثال پیش کرتی ہیں۔انھوں نے انسان دوستی اور ایک دوسرے کے مذاہب کے احترام کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ اسی لیے وہ خود بھی اس میں غوطہ زن ہوکر ایسے موتی نکال لاتے ہیں کہ جس کی چمک روح کو منور کر دیتی ہے۔ان کی شاعری کا سب سے درخشاں پہلو بے تعصبی اور عدم مساوات ہے۔ ہر مذاہب کے پیشوا کا انھوں نے احترام کیا ہے۔ ہر مذہب کے تہوار کو اسی کے رنگ میں رنگین بنا کر پیش کیا ہے جو قاری کو حیرت و استعجاب میں ڈالتا ہے ۔ ان کی نظمیں ، دوالی ، ہولی ، عیدالفطر راکھی ، نانک شاہ گرو، جنم کنہیا جی، بانسری، ہولی کی بہار، عرس حضرت سلیم چشتیؒ، شری کرشن اور کنہیا جی پر کئی نظمیں باہمی میل ملاپ اور اتحاد و یگانگت کی بے مثال تصویریں ہیں۔نظم کنہیا جی کے کھیل کود سے ایک بند ملاحظہ ہو:

تعریف کروں میں اب کیا کیا اس مرلی دھر بجیا کی
تت سیوا کنج پھرایا اور بن بن لٹو چریا کی
گوپال ، بہاری ، بنواری ، دکھ ہرنا مہر کرپا کی
گردھاری سندر، شیام برن اور بلدھر جی کے بھیا کی
یہ لیلا ہے اس نندللن من موہن جسمت چھیا کی
رکھ دھیان سنو، ڈنڈوت کرو، جے بولو کشن کنہیا کی

''ہولی'' ہندوستان کا رنگ برنگا تہوار ہے جو بہت جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔جس میں رنگوں کے ذریعہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ نظیر نے اپنی نظم کے ذریعہ ہولی کا خوبصورت منظر پیش کیا۔

گلزار کھلے ہوں پریوں کے ، اور مجلس کی تیاری ہو
کپڑوں پر رنگ کے چھینٹوں سے خوش رنگ عجب گلکاری ہو
منہ لال، گلابی آنکھیں ہوں، اور ہاتھوں میں پچکاری ہو
اس رنگ بھری پچکاری کو ، انگیا پر تک کر ماری ہو
سینوں سے رنگ ڈھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

نظیر ایک طرف دوالی، ہولی کا ذکر کرتے ہیں تو دوسری طرف عیدالفطر کے منظر کو دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں جو بے تعصبی، رواداری، انسان دوستی اور مساوات کا اعلیٰ نمونہ ہیں عیدالفطر نظم ملاحظہ ہو۔

کیا ہی معانقے کی مچی ہے الٹ پلٹ
ملتے ہیں دوڑ دوڑ کے باہم جھپٹ جھپٹ
پھرتے ہیں دلبروں کے بھی گلیوں میں غٹ کے غٹ
عاشق مزے اڑاتے ہیں ہر دم لپٹ لپٹ
ایسی نہ شب برات نہ بقرید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

مولانا عبدالباری آسی کا خیال ملاحظہ:

''دنیا میں ہزاروں رسوم ہیں جو ہر تیوہار اور ہر شادی وغم کے موقع پر برتی جاتی ہیں مگر ان کے جزئیات کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں، مگر نظیر کو دیکھیے کہ وہ بغیر اس کے کسی چیز پر نگاہ ڈالتا ہی نہیں''۔

نظیر کو ہندوستان کے ذرہ ذرہ سے بے انتہا محبت تھی ان کی نظموں میں میلوں، ٹھیلوں کے علاوہ پھلوں اور ترکاریوں کی تعریف اس انداز سے کی ہے کہ نظیر کے مقامی رنگ کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کی ایک عام سی ترکاری کو کس قدر توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ ککڑی کی تعریف جزئیات نگاری کی بہترین مثال ہیں ملاحظ ہو

کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں
گنے کی بوریاں ہیں ریشم کی تکلیاں ہیں
فرہاد کی نگاہیں شیریں کی ہنسلیاں ہیں
مجنوں کی سرد آہیں لیلا کی انگلیاں ہیں
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کا فراسکندرے کی ککڑی

ہندوستانی آب وہوا میں خاص کر سردی کے موسم میں ''تل کے لڈو'' اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔تل کے لڈوں کے صفات پر روشنی

ڈالتے ہوئے اس کے فوائد بیان کیے ہیں۔

نظیر نے انسان دوستی مساوات کی بہترین مثال اپنی نظم ''آدمی نامہ'' کے ذریعہ پیش کی ہے ہر انسان پہلے آدمی ہے، رنگ و نسل، مذہب و عقائد، امیر غریب، طاقتور اور کمزور، اعلیٰ وادنیٰ، بادشاہ وفقیر، مزدور و امیر، عالم و جاہل، کافر و مومن، غرض، سب آدمی کی صف میں کھڑے ہیں۔ انھوں نے ''آدمی نامہ'' کے ذریعہ انسانی محبت اتحاد و اتفاق کا ایسا منشور پیش کیا کہ اردو شاعری میں پہلی بار آدمی کے مختلف روپ ابھر کر سامنے آ گئے ہر آدمی قدر و توجہ کا مرکز بن گیا۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

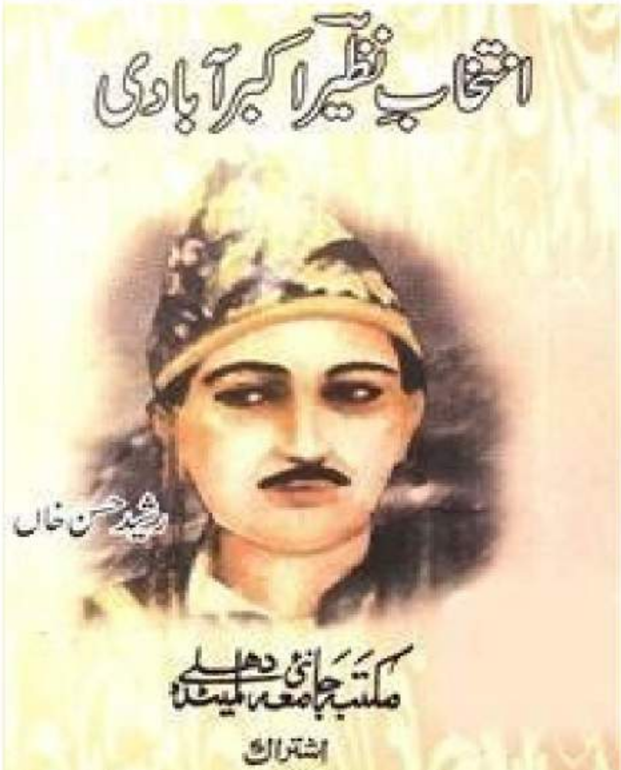

شادی بیاہ کے موقع پر اس دور میں جو رسومات ہوا کرتے تھے ان کی تفصیل کو اس قدر خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ معمولی جزئیات کو بھی اہمیت کا حامل بنا دیا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی رسم کے مطابق جہیز کی تفصیلات یوں بیان کی ہے۔

زر زیور کے واں ڈھیر لگے، جو باہر ہووے گنتی سے
وہ موتی، ہیرے، انمولے ولعل زمرد کے ڈبے
وہ کلسے بڑے چاندی کے، وہ تھال کٹورے سونے کے
وہ فرش سنہرے نقش بھرے جو بچھتے محلوں بیچ پڑے

اثر لکھنوی لکھتے ہیں:

''نظیر کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں معمولی اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات کو شاعر کی فنکاری نے صناعت کا بہترین مرقع بنا دیا ہے۔ جس عنوان پر قلم اٹھایا ہے اس خوبی اور تفصیل سے بیان کیا ہے کہ تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے''۔

نظیر کی نظموں سے ان کے وسیع تجربات و مشاہدات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کو بہت غور سے دیکھا پرکھا، اور جو کچھ بھی محسوس کیا مثالوں، تشبیہوں کے ذریعہ موثر انداز میں پیش کیا۔ وہ نہ صرف زندگی بلکہ دنیا کی بے ثباتی اور موت کی حقیقت کی تلخی کا احساس دلا کر عیش و عشرت میں پڑے لوگوں کو بیدار کرتے ہیں اور دنیا کو یہ درس دیتے ہیں ہے کہ انسانیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے محبت و اتحاد سے رہیں۔

اختر اورینوی نے نظیر کی شاعری کے متعلق بہت خوب کہا ہے:

''الغرض نظیر کی شاعری بہت ہی بلند مقام رکھتی ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی تہوں میں اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے ہے''۔

نظیر کی نظموں کی نمایاں خصوصیت جزئیات نگاری ہے جو ان کے فن پر حاوی نظر آتی ہے وہ جزئیات کے ذریعہ ہی نظم کو موثر اور دلکش بناتے ہیں۔ ان کی کوئی نظم ایسی نہیں ہے جو جزئیات سے خالی ہو۔ انھوں نے جزئیات و تفصیلات کے ذریعہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کو اس قدر واضح کر دیا ہے کہ قاری کی معلومات میں ہر پل اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں گویا ہندوستانی تہذیب کی کل کائنات موجزن ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جزئیات کے دریا میں الفاظ کی روانی موتیوں کی لڑی بن کر چمکنے لگتی ہے جو ہر دل کو لبھاتی ہے اور ہر دل اس کا گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

□□□

Dr. Fareeda Begam
Guest Lecturer
Dept. of Urdu Farsi
Gulbarga University
Gulbarga-585106 (Karnataka)

ڈاکٹر شاہد الرحمٰن

مہجری ادب کی قوی آواز
عشرت معین سیما

عشرت معین سیما کل یگ کی ابھیمنیو ہیں جو نہ صرف یہ کہ چکرویوہ میں داخل ہونے کے فن سے واقفیت رکھتی ہیں بلکہ دواپر یگ کے ابھیمنیو کے برعکس اسے توڑ کر باہر نکلنے کے علم پر بھی دسترس رکھتی ہیں۔ اس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ابھیمنیو اپنی کمی کی وجہ سے اپنی جان گنوا دیتا ہے لیکن عشرت اپنے ہنر کے ذریعہ معرکے میں فتح سے ہم کنار ہوتی ہیں۔ یہ دیگر بات ہے کہ دونوں کا میدانِ عمل بالکل جدا جدا ہے۔ ان دونوں کے میدانِ عمل میں ایک اور بڑا فرق یہ بھی ہے کہ اس کا چکرویوہ محدود تھا لیکن عشرت کا چکرویوہ لامحدود ہے، بے انتہا زاویوں پر محیط جسے ہم ایک لفظ میں 'زندگی' کہتے ہیں۔ میں نے اصطلاح 'کل یگ' کا استعمال کچھ خاص معنوں میں کیا ہے۔ عام طور پر ہندو مائتھولوجی میں کال چکر کے اس حصے کو کل یگ تسلیم کیا جاتا ہے جسے عام فہم زبان میں مشینی یا مشینوں کے دور سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی بنیادی شناخت اس کے ان اوصاف کے مدنظر طے پاتی ہے جسے ہم ظلم و تشدد، بے ایمانی، استحصال، بدعنوانی، بے راہ روی وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان باتوں کے مدنظر عشرت کے افسانوں کو ہم عصر حسیت کا بیان اور ان سے منسلک تخریب کاریوں کا مداوا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے کا نام 'گرداب اور کنارے' سے بہتر اس مناسبت سے کوئی دوسرا نام نہیں ہو سکتا کہ تخلیق کار نہ صرف یہ کہ تلاطم میں کودنے کی ہمت رکھتی ہیں بلکہ اس سے بہ خوبی باہر نکل کر اس راز کو سماج کے علم و ہنر میں پرونے کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں!!

عشرت معین سیما کے افسانوی مجموعے 'گرداب اور کنارے' میں کل اٹھارہ افسانے ہیں۔ یہ افسانے عصری آگہی کا منبع ہیں، خاص طور پر ان زندگیوں کی تفہیم کا سراغ جنھیں ہم 'اردو کی نئی بستیوں' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ حالاں کہ اردو کی نئی بستیوں میں زیادہ تر توجہ شاعری اور خاص طور پر غزل پر صرف کی گئی اور شاید یہی وجہ ہے کہ افتخار عارف، ساقی فاروقی، اکبر حیدر آبادی، عادل منصوری، افتخار نسیم، منیب الرحمٰن، ناصر سلطان کاظمی، عاشور کاظمی ایسے اہم شعرا بغیر کسی خاص ذہنی کاوش کے ہمیں زبان زد ہیں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ فکشن کا دامن یکسر خالی اور عاری رہا، اس کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔ فکشن کے حصے میں بھی ستیہ پال آنند، خالد سہیل، حیدر قریشی، رضیہ فصیح احمد، انور شیخ، جاوید دانش، عشرت معین سیما جیسے ناقابلِ فراموش نام ہیں۔

کہتے ہیں کہ جو ادیب اپنے ماحول سے غافل ہو کر ادب کی تخلیق کرتا ہے، اس کا ادبی اعتبار قائم نہیں ہو پاتا۔ عشرت معین سیما کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کا ایک ایک صفحہ اپنے آس پاس کے ماحول کی نذر کر رکھا ہے۔ اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ زندگی کو پھیلانے یا

ہمہ گیری عطا کرنے کی خاطر مصنفہ کو اس قدر دور دراز کی خاک نہیں چھاننی پڑی جس سے ایک نوع کی اجنبیت کا احساس پیدا ہو جائے۔ افسانہ نگار نے اپنا طور واضح کر دیا کہ جس زندگی اور موضوع سے میں واقف ہوں، اسی کے اردگرد مجھے رہنا ہے، جن باتوں کی تہ در تہ سے میں واقف ہوں، انھیں کو اپنے افسانوں میں برتوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ تخیل کی اڑان، ماضی اور حال کو جوڑتا ہوا کوئی جذباتی سارشتہ، آس پاس کی زندگی کی تفصیلی پیش کش کا بہترین امتزاج، عشرت معین سیما کی افسانہ نگاری کا خاصہ ہے۔

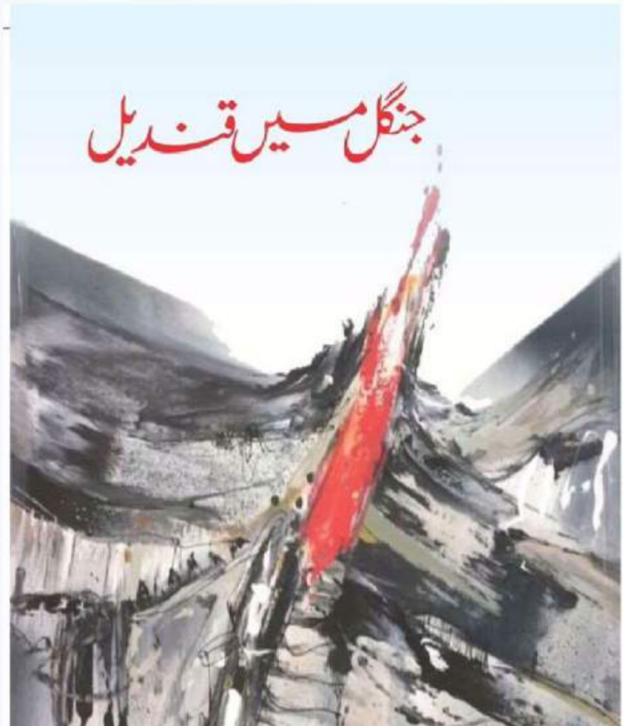

ہمارا معروضہ ہے کہ عشرت معین سیما کی ادبی شخصیت کے عناصر ثلاثی ہیں---مجری کرب، تانیثی اضطراب اور عصری حسیت۔ انہی امور کے اردگرد عشرت معین سیما کی شخصیت، فکشن اور تمام تر کارکردگی طواف کرتی ہے۔

عشرت معین سیما کے فکشن کی کائنات کی بساط پاکستان سے لے کر جرمنی تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایسے میں ان کا فکشن مجری ادب کے زمرے میں شمار کیا جائے گا۔ مجری فکشن کے باب میں ان کا جائزہ لینے سے پہلے، مجری ادب پر تھوڑی روشنی ڈالنا ضروری ہے، کہ ان خصائص کی تھاہ لگائی جا سکے جو کسی ادب کو مجری بناتے ہیں۔

اردو میں مجری ادب کی ایک مستحکم روایت موجود ہے۔ یہ اردو ادب کا ایک روشن باب بھی گردانا جا سکتا ہے کیوں کہ نقدِ ادب کے پیمانے پر یہ اندرونِ ملک کے ادب سے کسی بھی طرح اٹیس نہیں ہے۔ ہندو پاک کے مختلف ادبا نے اپنے وطن سے ہزاروں میل دور، یوروپ، امریکہ، خلیجی ممالک اور افریقہ وغیرہ میں بھی اپنی کیفیات کو رقم کرنے اور جذبات کو فکشن اور شاعری میں پرونے کا بھرپور فریضہ انجام دیا ہے۔ جب ہم اردو کے مجری ادب کی بات کرتے ہیں اور اس کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ افتخار عارف، ساقی فاروقی، اکبر حیدر آبادی، عادل منصوری، افتخار نسیم، منیب الرحمان، ناصر سلطان کاظمی وغیرہ ایسے نام ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو ایک نئے موضوع سے آشنا کرایا، نئے تجربے کیے اور مرکز کی شاعری سے اسے کبھی الگ نہیں ہونے دیا۔ اسی طرح فکشن کے باب میں ڈاکٹر سید سعید نقوی، آصف الرحمٰن طارق، اکرام بریلوی، امجد مرزا امجد، بانو ارشد، بلند اقبال، تانیہ رحمٰن، حمیدہ معین رضوی، محسنہ جیلانی، محمد عمر میمن، نسیم سید، نیلم احمد بشیر، مصطفیٰ کریم، عطیہ خان، عظمیٰ صدیقی، صفیہ احمد، شعیب صادق، شکیلہ رفیق، ڈاکٹر شہلا نقوی، عبداللہ جاوید، سہیل جاوید وغیرہ وہ مردِ مجاہد ہیں جنھوں نے وہ بیان کیا جو دیکھا، وہ سنایا جو محسوس کیا، وہ رقم کیا جو بیتی اور ایسا کرنے کے مرحلے میں دیارِ غیر میں اردو ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کرتے رہے۔

اصطلاح میں مجری ادب اس ادب کو کہا جاتا ہے جو ایسے لوگوں کے ذریعہ تخلیق کیا گیا ہو جنھوں نے اپنے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات سے دوچار ہو کر مادرِ وطن سے ہجرت کی ہو اور پھر جب ان کو اپنے وطن کی یاد، بعض اسباب کی بنا پر ستانے لگے تو ایسے حالات میں ادیبوں کے ذریعہ جو ادب تخلیق پاتا ہے اس ادب کو ابتدائی دنوں میں 'پردیسی ادب' کے نام سے موسوم کیا گیا مگر بعد میں اسی ادب کو 'مجری ادب' کا نام دیا گیا جو کہ عربی ادب سے مستعار ہے اس لیے کہ عربی ادب میں مجری ادب انیسویں صدی کے شروع میں تخلیق پا رہا تھا اور اسے مجری ادب کے نام سے جانا بھی جاتا تھا۔ خلیل جبران نے جب بوسٹن شہر کو اپنا وطنِ ثانی بنایا تو وہ کچھ یوں گویا ہوئے:

> 'میں اس چمکتی دمکتی دنیا میں اب بھی ایک اجنبی ہوں، ایک بیراگی، ایک مسافر، اور مسافرت اور پردیس کے دن اتنے دکھ بھرے اور تکلیف دہ ہوتے ہیں کہ ایک ایسے طلسماتی وطن کی یاد میں کھو جاتا ہوں جسے میں خود نہیں جانتا اور پھر اپنے خوابوں کی دنیا کو اس سرزمین کے تصور سے آباد کرنے لگتا

ہوں جسے میں نے آنکھوں سے آج تک نہیں دیکھا'۔

(بہ حوالہ: سید ضیاء الحسن ندوی: پیش لفظ، عربی ادب دیارِ غیر میں؛ معین دکن پریس، حیدرآباد: 1981؛ ص:5)

عبدالحلیم ایسے دانش ور، مہجری ادب کی اہمیت وافادیت کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

'مہجری ادب ایک جان دار، شان دار، طاقت ور اور ٹھوس مکتبِ فکر ہے جس میں جمال بھی ہے اور جلال بھی، حسن بھی ہے اور شباب بھی، دل داری بھی ہے اور دل نوازی بھی اور ایک بامقصد، باسلیقہ اور خوبصورت زندگی کے طور طریقے اور انداز واطوار بھی'۔

(بہ حوالہ: سید ضیاء الحسن ندوی: پیش لفظ، عربی ادب دیارِ غیر میں؛ معین دکن پریس، حیدرآباد: 1981؛ ص:11-12)

مندرجہ بالا مباحث کے بعد مہجری ادب کی مزید تفصیل میں جانے کی نہ ضرورت ہے اور نہ اس مضمون کا ایسا کوئی مقصد ہی ہے۔ یہ ذکر تو ضمناً آ گیا ہے کیوں کہ اس حوالے سے گفتگو کو آگے بڑھانا مقصود ہے؛ جن کے حوالے سے نقد کا فریضہ انجام پا جائے گا، پرکھ کی کسوٹی مطعین ہو جائے گی اور عشرت معین سیما کا مہجری فکشن نگاری میں مقام متعین ہوگا۔

مہجریت کا احساس عشرت معین سیما کو فکشن کی تخلیق کے لیے مواد فراہم کرتا ہے اور وہ تخلیقی کرب سے روشناس بھی ہیں، اس لیے اس سطح پر تبدیلیاں برپا کر پانے میں وہ بہ آسانی کامران ہیں۔ ان کے دکھ ذرا مختلف ہیں اس لیے اظہار کا طریقۂ کار، زبان وبیان، اسلوب، لفظیات، علامات واستعارات، تشبیہات وتلمیحات اور تراکیب ایک ہی طرح کے ہونے کے باوجود، ان کے موضوعات میں تہذیبی وثقافتی اور سماجی کش مکش کی تلخیاں اور اپنی مٹی سے دوری کا رنج؛ سب مل کر رنج ونشاط کا ایک ایسا پیکر تراشتے ہیں جس سے مہجری کرب ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ نوسٹلجیا کی ایک ایسی صورت ابھر کر گردش کرنے لگتی ہے جو بعض اوقات ایک معدوم سے سایہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور بعض دفع ایسی جیتی جاگتی تصویر بن کر ابھرتی ہے جس سے کہ قاری کی آنکھوں کے سامنے درد وکرب کا ایک ایسا منظر ابھرتا ہے جیسے کوئی بولتی فلم۔ جب وہ ذات کے حوالے سے گفتگو کرتی ہیں تو دراصل وہ اپنی ذات کے داخل سے خارج کی طرف مراجعت کرتے ہوئے پوری بنی نوع انسان کے شعور تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہی ان کا ثقافتی المیہ ہے۔ وہ فن کی نظریاتی بنیادوں پر یقین رکھتے ہوئے مستقبل کو تابناک بنانے کا خواب دیکھتی ہیں تاکہ ان کا آنے والا کل روشن ہو۔ ان کے یہاں تنہائی کا شدید احساس، بھیڑ میں کھو جانے کا ڈر اور اپنی آواز کے معدوم ہو جانے کا ایک نامعلوم سا خوف ملتا ہے۔ انھیں ہر لمحہ یہ احساس دامن گیر رہتا ہے کہ اجنبی ماحول میں وہ خود کو بے گانگی کے رشتے میں پرو کر، اپنی زمین سے الگ کر چکی ہیں جہاں تنہائیاں انھیں صدائیں دیتی ہیں۔ غیر مانوس فضا اور ماحول میں ان کا سایہ ہی ان کا رفیقِ کار ہے۔ ذات کے اندرون میں پنپتی افسردگی اور اداسی نے انھیں عجیب سے کرب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ عشرت معین سیما نے دیارِ غیر میں شعوری طور پر اپنی ادبی اور ثقافتی ورثے کی بازیافت میں بھی کامیابی پائی ہے۔

☆وطن زمین کا وہ حصہ ہوتا ہے جہاں آپ پیدا ہوتے ہیں، جہاں کی آزاد فضا میں آپ پلے بڑھے ہوں، جہاں کی مٹی کی خوشبو دنیا کی ساری خوشبوؤں سے زیادہ سوندھی اور بھینی ہوتی ہے، جہاں دریا گیت گاتے ہوں اور جہاں کی ہوائیں امن وسکون کی لوریاں سناتی ہوں، جہاں کے لوگ ایک دوسرے سے اتنا پیار کرتے ہوں، ایک دوسرے کا اتنا خیال رکھتے ہوں کہ کچھ نہ پوچھو!

(عشرت معین سیما؛ گرداب اور کنارے/18)

عشرت کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ان کا کینوس کافی وسیع ہے۔ انھوں نے زندگی کے گوناگوں مسائل کو محسوس کیا ہے، ان کو قریب سے دیکھا ہے، پرکھا ہے، پھر قلم اٹھایا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انسانی زندگی کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کو قلمبند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انسانی زندگی کے مسائل اور اس کی شعریات کو ڈی کوڈ کرنے میں عشرت نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور شاید اسی وجہ سے وہ بیش تر مسائل اور پہلوؤں کو اس حد تک کامیابی سے برتنے پر قادر ہیں۔ مسئلہ ہم جنسیت کا ہو، جنسی استحصال کا ہو یا پھر دہشت گردی کا، یوروپ میں مستقل باشندگی حاصل کرنے کا ہو یا پھر یوروپی ممالک کی انسانیت کے دوغلے معیار کا، بڑی تعداد میں لڑکیوں کی پیدائش کا ہو یا پھر شک جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر جلد بازی میں لیے گئے فیصلے کے نقصان کا، قسمت آزمائی کے لیے لاتعداد شادیوں کا ہو یا پھر بے جوڑ شادیوں کے ہولناک نتائج کا، وطن سے محبت کا ہو یا چہرے پہ چہرہ سجائے اپنے غم کو غلط کرنے کے فراق میں گھوم رہے لوگوں کا، غمِ فراق ہو یا غمِ روزگار، تعلیم کی اہمیت ہو یا امیدوں کا ٹوٹنا، مذہب ہو یا مذہب کے متعلق اپنی آزادانہ آرا، فلسفہ ہو یا یوروپ کی بے راہ روی کی زندگی ہو پھر اپنی ثقافت اور مذہب کی طرف لوٹ آنے کے مراحل؛ گویا کہ انسانی زندگی کے بیش تر پہلوؤں کو انھوں نے اپنے فن میں جگہ دی ہے اور وہ جگہ جنت نما ہے۔

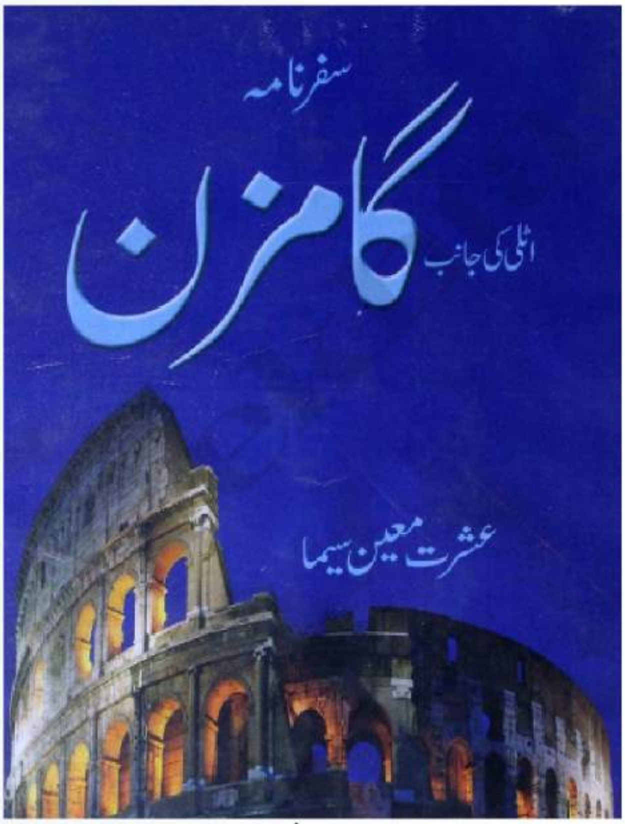

عشرت معین سیما کے افسانوی فن کی تیسری منزل کے طور پر عصری حسیت کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ایران توران کی باتیں کرنا، گل ورخسار کی پیش کش، آفاقیت میں گم رہنا، ماضی کے پرشکوہ واقعات وتاریخ میں نشہ آور ہونا؛ ادب میں حسن تو ضرور پیدا کرتے ہیں لیکن محض انہی کے سہارے کوئی بھی ادب، بڑا ادب نہیں بن سکتا۔ اپنے گردوپیش کے حالات و مسائل سے لڑنا، خود بھی لڑنا اور سماج کی بھی ایسی تربیت کرنا، ترغیب دینا کہ وہ بھی اس سے دودو ہاتھ کرنے کو کمربستہ ہوجائے، ادب کا ایک اہم تقاضا اور فرضِ عین بھی ہے۔ مسئلہ خواہ عہدِ ماضی سے سماج میں پیوست چلا آرہا ہو یا پھر اس نے اوقات وحالات کے تغیر کے ساتھ جنم لیا ہو یا پھر ترقی یافتگی کے مراحل میں بیج کی طرح اس کا خود بہ خود وجود پاجانا ہو، عشرت معین سیما مسائل سے گھبراتی نہیں ہیں، اس سے لڑتی ہیں، مناسب حل کی تلاش میں مختلف راہوں پر، جہاں بھی امید کی کوئی کرن دِکھ جاتی ہے، اس پر گامزن ہونے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں اور جب ارادہ مضبوط ہوتا ہے، نیت صاف ہوتی ہے تو کامیابی دامن گیر ہوہی جاتی ہے۔

قصہ گوئی کے مرحلے میں عشرت نے اپنی زبان کی روایت کو ذہن میں رکھا ہے۔ بیانیہ کا نپا تلا اور برسوں آزمایا فورمولہ انھیں بھی راس آیا ہے۔ باتوں کے سلسلے کو منطقی ربط کے ساتھ، سلسلے وار پیش کرتے ہوئے اپنی کہانی مکمل کرلینا عشرت کا عمومی انداز ہے۔ لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ہر کہانی، ہر واقعہ افسانے کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے؟ کیا ہر مضمون افسانہ کہلاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! وہ کیا عوامل ہیں جو کسی واقعے یا مضمون کو کسی بھی تحریر کے خانے سے نکال کر افسانے کی فہرست میں جگہ دلاتے ہیں؟ ظاہر ہے وہ خصائص بیانیہ اور کہانی پن ہیں جو مضمون اور افسانہ کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے پر مصر ہوتے ہیں۔ عشرت کے تمام تر افسانوں میں قریب کی زندگی موجود ہوتی ہے لیکن ان کی یہ خوبی ہے کہ وہ بیان کی حدود سے بھرپور واقفیت رکھتی ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ محض ایک جملے سے کب افسانہ مضمون بن جاتا ہے اور کب مضمون افسانہ اور کیسے مضمون کو نکال کر فکشن کے حصار میں ڈالا جاسکتا ہے۔ انھوں نے واقعات کو ہرگز کہانی پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ انھیں معلوم ہے کہ واقعات کو کس حد تک برسرِ روزگار ہونے دینا ہے اور کس طرح ان کی فطری رفتار ومقدار قائم رکھنا ہے۔ اسی لیے اس مجموعے کے سارے افسانے واقعات کی حدود سے نکل کر فکشن کا واضح نمونہ بن جاتے ہیں جو ان کی بھرپور کامیابی کی ضمانت ہیں:

☆ جب دلیلیں کم پڑنے لگتی ہیں تو مجھے ایسی ایسی مثالوں کا سہارا لینا پڑتا ہے جو یا تو حقیقت سے بالاتر ہوتی ہیں یا ان خوش گمانیوں پر مبنی جو کہ مجھے خوش فہمیوں کے ہنڈولے میں جھولاتی رہتی ہوں۔

(ایضاً13)

☆ سچ ہے کہ جب انسان اپنے فرائض کو سمجھنے لگے تو حقوق حاصل ہونے کی تمام راہیں خود بہ خود ہموار ہوجاتی ہیں۔ زندگی صرف گردشِ ایام یا جہدِ مسلسل نہیں رہتی بلکہ رب کی رضا اور مہربانیوں کے ساتھ قدرت کے نظام کا حصہ بننے لگتی ہے۔ انسان اپنے انسان ہونے کا فخر حاصل کرلیتا ہے۔

(ایضاً58-59)

موجودہ عہد کی خواتین فکشن نگاروں میں زاہدہ حنا، ترنم ریاض، ذکیہ مشہدی، غزال ضیغم، ثروت خاں، نگار عظیم کے مقابلے عشرت نے کم ہی لکھا ہے اور شہرت وکامیابی کے معاملے میں بھی ان کے ذریعہ کھینچی گئی لکیر پر ابھی عشرت کو لمبی مسافت طے کرنا ہے۔

□□□

Dr. Shahidur Rahman
Assistant Professor
HOD Department of Urdu
Nalanda College
Bihar Sharif
Distt. Nalanda-803101(Bihar)

ڈاکٹر شیریں ناز

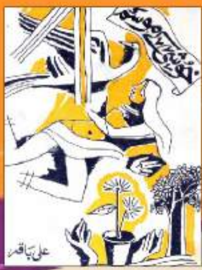

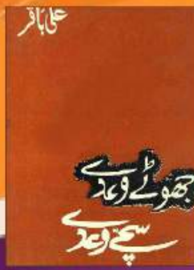

علی باقر کا افسانوی فن

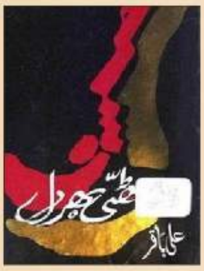

کسی بھی فنکار کی ایک شخصیت ہوتی ہے، جس کا اپنا انفرادی کردار بھی ہوتا ہے۔ اس انفرادی کردار کی تشکیل میں فنکار کی ذات اور اس کے ذاتی تجربات کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ان تجربات کا دائرہ بھی فنکار کی ذات کی طرح بیحد وسیع ہوتا ہے، خواہ وہ تجربہ عشقیہ ہی کیوں نہ ہو۔

علی باقر بھی زندگی کے تجربوں سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مشاہدے میں جو سب سے نمایاں چیز در آئی ہے، وہ عشق ہی ہے۔ یہ عشق کی کیمیا گری بھی کچھ یوں ہی وجود میں نہیں آئی، البتہ واقعہ یہ ہے کہ علی باقر کا عشق اس مصرعہ کی تصدیق کرتا ہے:

ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

حقیقت یہ ہے کہ علی باقر کے افسانوی سرمایہ میں جس عشق کی جابجا نشاندہی ملتی ہے، وہ محض گیسوئے لیلیٰ کو سنوارنے تک ہی محدود نہیں ہے اور نہ ہی صرف مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلقات کا وہ جذبہ ہے جو ایک سطح پر پہنچ کر انسانیت کا بدل بن جاتا ہے۔ عشق ایک حیات بخش جذبہ اور انسانی جبلت کا نام ہے، یہ بات علی باقر کو بخوبی معلوم ہے۔ علی باقر نہ صرف افسانہ نگار ہیں، بلکہ حقیقت کو رومانوی رنگ میں شدت کے ساتھ پیش کرنے والے افسانہ نگار ہیں۔ حقیقت پسند ادب اور مہجری ادب دونوں علی باقر کی افسانہ نگاری میں پیوست ہو گئے ہیں، جیسے خود ان کی روح میں مشرقی زندگی کے اندر مغربی زندگی۔

علی باقر اس دور سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی پہلی کڑی ترقی پسند ادب سے جڑی ہوئی ہے اور دوسری کڑی جدیدیت سے۔ گو کہ جدیدیت کا سفر علی باقر کے یہاں قطعی طور سے نظر نہیں آتا؛ البتہ وہ ترقی پسند بھی نہیں جہاں ادب، ادب نہ رہ کر نعرے بازی ہو جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ علی باقر سماجی حقیقت پسند ہیں، جہاں مذہب و ملت، رنگ و نسل، فرقے، طبقے ان تمام چیزوں سے بڑی انسان دوستی اور عشق ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی پیروی نے علی باقر کے فن کو عالمگیر بنادیا ہے۔ جہاں ایک جانب وہ عصمت اور منٹو کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہیں دوسری جانب کرشن چندر جیسی رومانی فضا بھی قائم کرتے ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ علی باقر کا افسانوی فن حقیقت اور رومان کے درمیان ایک مضبوط کڑی ہے۔

علی باقر کے افسانوں کی ابتدا بڑے دلچسپ پیرائے میں ہوتی ہے، جس میں اختصار بھی شامل ہوتا ہے۔ دلکش اور مسحور کن اسلوب میں چھوٹے جملے ندرت پیدا کرتے ہیں۔ علی باقر کے بیشتر افسانے کی ابتدا پلاٹ اور واقعات سے مربوط ہے، اس میں ایک منطقی تسلسل ہے۔ اختصار کا فن، جو افسانے کی ایک اہم شرط ہے، وہ علی باقر کے افسانوں میں موجود ہے۔ وہ واقعات کے سرے کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ انسانی زندگی کا کوئی ایک پہلو واقعہ، حادثہ ہی افسانے میں بیان ہو سکتا ہے اور اس کے لیے جس بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے وہ علی باقر کے یہاں موجود ہے۔

یہی سبب ہے کہ انھوں نے جہاں ایک جانب ''خاموشی'' جیسا طویل افسانہ لکھا، وہیں دوسری جانب ''بخار'' جیسا مختصر افسانہ بھی۔ کہا جاتا ہے کہ ہر شخص کے اسلوب میں انفرادیت ہوتی ہے، لیکن ہر تخلیق کار کے اسلوب میں کشش پیدا نہیں ہوتی۔ علی باقر کے اسلوب میں انفرادیت کے ساتھ ایک کشش بھی موجود ہے، جو ان کی شناخت ہے۔

افسانے کے عنوان کے تعین میں علی باقر نے کسی خاص اصول کی پابندی نہیں کی ہے۔ کبھی وہ افسانے کا عنوان تخلیق سے پہلے کرتے ہیں اور پھر عنوان کے زیر اثر مکمل کہانی گھومتی ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ وہی ان کا نقطۂ نظر بھی ہے۔ مثلاً ''بخار''۔ اور بعض اوقات وہ کہانی لکھنے کے بعد اس کے عنوان کا تعین کرتے ہیں، مگر ایسی صورت میں وہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کہانی کی روح عنوان میں اتر جائے۔ جیسے ''شراب اور شہد''۔ ایک اور طریقہ علی باقر کے یہاں عنوان اخذ کرنے کا یہ ہے کہ وہ کہانی کے مرکزی خیال سے عنوان منتخب کر لیتے ہیں جیسے ''گھونگھٹ''۔ عنوان کے لیے ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مرکزی کردار کے نام سے عنوان منسوب کیا جائے، مگر یہ صورت حال علی باقر کے یہاں بہت کم ہے، مثلاً ''لڈو''۔ علی باقر کی بیشتر کہانیاں وہاں ختم ہوتی ہیں، جہاں قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس سے آگے کی بات کہہ دی جاتی تو مزہ کم ہوجاتا۔ کہانی کے اختتام کا یہ بہترین طریقہ ہے جہاں ایک جانب تجسس باقی رہ جاتا ہے اور دوسری جانب قاری یہ سوچنے لگتا ہے کہ آخر ایسا کیوں؟ یہ صحیح تھا یا غلط؟ دراصل یہی سوال ایک اچھے فنکار کی فنی خوبیوں کا غماز ہے۔

علی باقر کے افسانوی سفر کی تفہیم کے لیے افسانے کے بنیادی عناصر اور علی باقر کے فن کو زیر بحث لانا ضروری ہے۔ بغور دیکھا جائے تو علی باقر اپنے افسانوں کا تانا بانا کچھ یوں بنتے ہیں کہ وہ کسی خاص واقعہ یا روزمرہ کے واقعات کا ایک خاص روشنی میں مکمل خاکہ تیار کرتے ہیں، پھر اس خاکے کو کرداروں کے افعال کے حوالے سے ظاہر کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہی خاکہ دراصل افسانے کا پلاٹ کہلاتا ہے، جسے علی باقر نے اپنے زیادہ تر افسانوں میں فنی مہارت کے ساتھ برتا ہے۔ اہل علم و دانش یہ جانتے ہیں کہ پلاٹ ہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جس پل صراط سے گذرے بغیر افسانے کا وجود باقی نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہ صرف بیانیہ کی سطح پر بلکہ افسانے کے بنیادی عناصر کو بھی علی باقر نے اپنے افسانوں میں کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔

سادگی، واقعیت اور صدارت، جدت، نقطہ عروج اور دلچسپی یہ تمام عناصر افسانوی پلاٹ کا حصہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ علی باقر کے افسانوی سفر میں میں نے بھی اس کی تلاش کی اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ علی باقر صرف کہانی نہیں کہتے، بلکہ فنی کہانی کہتے ہیں، جن میں مندرجہ بالا تمام عناصر موجود ہیں۔

یہاں پلاٹ کے سلسلے کی چند باتیں اور وہ یہ کہ پلاٹ میں واقعے کی ترتیب نہایت ہی نازک مسئلہ ہے کیونکہ واقعہ کی ترتیب میں اختصار بہت ضروری ہے۔ لہٰذا پلاٹ ترتیب دینا ایک ماہر فن کا کام ہے۔

کسی بھی نثری اصناف ادب میں کردار کے بغیر کوئی کہانی مکمل نہیں ہوتی۔ کسی بھی افسانے کے واقعات فرد یا افراد کے گرد گھومتے ہیں۔ یہی کردار جذبوں کا بیان کرتے ہیں، حالات سے دوچار ہوتے ہیں یا حالات کو متاثر کرتے ہیں۔ لہٰذا یہی فرد یا افراد کی شکل میں افسانے میں نمودار ہوتے ہیں۔ علی باقر کے افسانوں میں یہی کردار دراصل سب سے اہم ہیں، جن کی مدد سے وہ ان کے مکالمے بھی ترتیب دیتے ہیں۔ انھیں کرداروں کے گرد واقعے کو ترتیب دے کر پلاٹ تیار کرتے ہیں۔ حقیقی دنیا کے چلتے پھرتے زندہ کردار کو علی باقر جب بھی بیان کرتے ہیں تو اس کردار کا سیاق وسباق اور اس کی جگہ زیادہ تر سات سمندر پار کے دیس میں رہتی ہے۔ یہ یوں ہی نہیں ہے بلکہ جو لوگ علی باقر کو جانتے ہیں وہ یہ بھی ضرور جانتے ہیں کہ ان کی تخلیق کا بیشتر حصہ دنیا کے اسی خطے میں وجود میں آیا۔ الغرض یہ کرداروں کی تخلیق کا عمل بھی ایک حقیقی اور منطقی عمل ہے۔ انسان جس معاشرے سے دوچار ہوتا ہے، اپنی فکری بساط کو وہیں سے جوڑتا ہے۔ اسے وہیں کے حالات، واقعات اور کردار نہ صرف زندہ کردار کے زمرے میں لاتے ہیں، بلکہ فنی اعتبار سے بھی کافی مستحکم نظر آتے ہیں۔

کردار کے توسط سے جہاں کہیں واحد متکلم کی صورت میں علی باقر موجود ہیں، وہاں بھی کردار نگاری کا فن کافی مضبوط ہے اور یہ ایک بڑا فن ہے، کیونکہ یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں کہانی کار خود تماش بین کی طرح یا تو موجود ہوتا ہے یا پھر خود کہانی کا کردار بن کر واقعات کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں بڑی نازک ہوتی ہیں۔ اکثر اس موڑ پر افسانہ نگار یا تو کہانی پر حاوی ہونا چاہتا ہے یا حالات کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ علی باقر کا فن اس عیب سے پاک ہے۔ دراصل لفظ ''میں'' کہانی میں بعض جگہ بڑی مشکلیں پیدا کرتا ہے، مگر اس مشکل کو علی باقر نے بخوبی سر کرلیا ہے۔ ''احسان''، ''بخار''، ''شراب اور شہد''، ''آرزو''، ''خاموشی''، ''جھوٹے وعدے، سچے وعدے'' وغیرہ افسانوں میں جہاں کہیں بھی علی باقر ''میں'' بن کر موجود ہیں وہاں کہیں بھی نہ تو یکسانیت ہے اور نہ کہیں تکرار۔ دراصل یہ وہ فن ہے، جس کے لیے فنکار کو خود کہانی میں اس قدر دخل دینا چاہیے جتنی

اس موضوع یا واقعہ کی مانگ ہے۔ اس میں ذرا سی بھی کمی بیشی فنکار کے فن کو مجروح کرتی ہے۔ اگر ایک دو جگہ کو چھوڑ دیں تو علی باقر نے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا ہے اور فن کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔

کرداروں کے بارے میں علی باقر کافی محتاط نظر آتے ہیں جو ان کے فن میں نکھار پیدا کرنے کا اہم سبب ہے۔ علی باقر کی حساس طبیعت صرف کردار کے ظاہری نکتے کا احاطہ نہیں کرتی، بلکہ اس کی نفسیاتی میلان کا بھی پتہ دیتی ہے۔ نتیجتاً قاری افسانوں کے کردار سے اس قدر مانوس ہوجاتا ہے کہ وہ خود اس تخلیق کا حصہ بننے لگتا ہے۔ نیز کردار کے جذبات و خیالات کا اظہار بھی صداقت کے سانچے میں ڈھل کر نکھرنے لگتا ہے۔ بعض اہل قلم نے علی باقر کے افسانوں میں موپاساں کی طرح چھوٹی سی بات کو خوبی سے کہہ دینے کا فن تلاش کیا ہے اور یہ سو فیصدی حقیقت بھی ہے۔ علاوہ ازیں علی باقر کے افسانوں میں تحلیل نفسی کا عنصر تو ہے، لیکن اس کی کھلی تقلید قطعی نظر نہیں آتی۔ علی باقر جو خود ایک ماہر نفسیات ہیں، کرداروں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں اور اسے فنکارانہ بصیرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ عورت کا ذکر بڑی بے باکی سے کرتے ہیں، مگر یہاں بھی وہ آسکر وائلڈ کے نظریے کے حامی نہیں ہیں، بلکہ اس سے ذرا الگ ہٹ کر اپنی راہ بناتے ہیں۔

الغرض کرداروں کے تعین میں بندھے ٹکے اصولوں کے قطعی پابند نظر نہیں آتے اور نہ ان کرداروں کو علی باقر کسی مخصوص نظریہ میں قید کرتے ہیں، بلکہ افسانے کے واقعات کے عین مطابق ان کا ہر کردار اپنا منطقی سفر طے کرتا ہے، جس میں کبھی وہ غمگین بھی ہوتا ہے اور کبھی خوشی کا اظہار بھی کرتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کے افسانوں کے کردار اپنی جذباتیت اور حسیت کے ساتھ افسانوں میں اترتے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنی منزل طے کرتے ہیں۔

علی باقر کی کردار نگاری کی اسی انفرادیت پر مشہور افسانہ نگار جوگندر پال کا یہ قول کافی اہمیت کا حامل ہے۔

''علی باقر کی کہانیاں بے ساختہ ہوتی ہیں ۔۔۔۔۔ کہانیاں پڑھ کر سچ مچ کے انگیزوں سے ملنے کا احساس ہوتا ہے''۔

کردار نگاری سے جڑی ہوئی ایک اور اہم چیز جو افسانے کا بنیادی عنصر ہے، وہ ہے مکالمہ۔ چونکہ کردار ہمیشہ اپنی پہچان اپنے مکالموں سے ہی کراتے ہیں۔ اس توسط سے بھی علی باقر کے افسانوں پر بات کی جانی چاہئے۔ علی باقر کی مکالمہ نگاری کے سلسلے میں حیات اللہ انصاری کا قول دیکھئے:

''وہ چھوٹی سی بات خود سے کہہ جاتے ہیں۔ موپاساں کی مانند علی باقر کے پاس زبان بھی ہے اور لہجہ بھی۔۔۔۔''۔

دراصل حیات اللہ انصاری کی مراد علی باقر کے افسانوں میں جملے کی ساخت اور مکالموں سے ہے۔ مکالموں کا کردار سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ پلاٹ خواہ کتنا ہی مشکل ہو، مکالمہ اس مشکل کو حل کردیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ افسانے کے کرداروں میں چھپے خیر و شر کو بھی علی باقر اس کی زبان سے ہی واضح کرتے ہیں۔ ہر کردار کے عادات و اطوار حرکات وسکنات مکالمے کے ذریعہ ہی افسانے کے پس منظر میں ابھرتے ہیں۔ اچھے مکالمے یا جملے وہی کہے جاتے ہیں جو رمز و کنایہ کی ایک دنیا اپنے اندر آباد رکھتے ہوں اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں ادا ہوجائیں ۔ یہ تمام خصوصیات علی باقر کے یہاں موجود ہیں۔

مکالمہ نگاری کے سلسلے میں جب میری نظر علی باقر کے افسانوں پر پڑی تو یہ احساس ہوا کہ مکالمے کے توسط سے علی باقر نے باتوں باتوں میں بیش قیمتی جملوں کی روشنی بکھیر دی ہے، جو نہ صرف علی باقر کے افسانوں کا طرہ امتیاز ہے بلکہ وہ اردو کے افسانوی ادب میں یقیناً ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرے گا یہاں اس طرح کے تمام جملے رقم کرنے کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ ہی موضوع سے اس کی مطابقت۔ مثالیں دیکھیں:

''یادیں خوابوں سے زیادہ نازک ہوتی ہیں۔ آپ ہی آپ ٹوٹ جاتی ہیں''۔ (گھونگھٹ)

''اس کی آواز اس کی آنکھوں کی طرح صاف اور پرخلوص تھی''۔ (تیزاب)

مندرجہ بالا جملوں کو پڑھ کر یہ لگتا ہے کہ آپ علی باقر کے افسانوں کی اصل کہانی کو کسی وجہ سے اگر بھول بھی جائیں تو یہ جملے قطعی نہیں بھول سکتے۔ یہ جملے زندگی کے نشیب و فراز سے گہری وابستگی کا پتہ دیتے ہیں، جس میں خوشی اور غم دونوں جذباتیت کی معراج پر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی موضوع یا فن سے مکمل واقفیت ہوجائے تو اسے واضح کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اس موضوع پر ایک کتاب لکھ دی جائے۔ اگر اس بیان میں صداقت کی نشاندہی مقصود ہو تو علی باقر کے افسانے ضرور پڑھنا چاہیے، کیونکہ زندگی جینا گر ایک فن ہے تو علی باقر زندگی کا فن کار ہے۔

□□□

Dr. Shirin Naz
S2/85
Meena Furniture House
Orderly Bazar,
Varanasi-221002 (U.P)

ڈاکٹر محمد اشتیاق احمد

سیدہ جعفر
کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت

حیدر آباد فرخندہ بنیاد جس کی تاسیس 1590 میں عمل میں آئی۔محمد قلی قطب شاہ نے جب اس کی بنیاد رکھی تو یہاں کے لطیف وخوشگوار موسم سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا تھا:

لطیف ودل کشا آب وہوائے
مبارک منزلے فرخندہ جائے

شروع ہی سے شہر حیدر آباد علم وادب اور تہذیب وثقافت کا مرکز رہا ہے۔یہاں نہ صرف مرد حضرات نے تحقیق کی دنیا میں نمایاں کردار ادا کیا ہے بلکہ خواتین نے بھی مردوں کے شانہ بشانہ اپنی علمی وادبی صلاحیتوں کے جلوے بکھیرے ہیں اور اپنی تحقیقی وتنقیدی بصیرت سے سینکڑوں ادبی شہ پاروں کی تلاش و تحقیق سے اردو ادب کی تاریخ کو نئی وسعتوں اور نئی جہات سے آشنا کر کے اس کا دامن بیش بہا موتیوں سے بھر دیا۔

سیدہ جعفر کا شمار ممتاز محققین میں ہوتا ہے وہ ایک اعلی پایہ کی استاد، ادیب، انشاپرداز، نقاد اور مخطوطہ شناس ہیں۔اردو زبان وادب کے لیے انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں بالخصوص دکنیات کی تحقیق وتدوین کے بہت سارے کام ان کی تحقیقی کاوش اور سخت محنت ولگن کا نتیجہ ہیں۔

سیدہ جعفر حیدر آباد کے مایہ ناز علمی وادبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں، ان کے جد اعلی سید رضی نے حضرت علیؓ کے خطبات مرتب کیے تھے۔نہج البلاغۃ کی ترتیب وتدوین ان کا یادگار کارنامہ ہے۔پروفیسر صاحبہ کے جد امجد سید والہ موسوی اپنے عہد کے بلند پایہ مصنف شاعر وانشاپرداز گزرے ہیں۔انھوں نے مثنوی 'پھولبن' کے جواب میں مثنوی 'طالب وموہنی' لکھی تھی اس مثنوی کو ڈاکٹر زور نے مرتب کر کے شائع کیا۔ولی ویلوری بھی سیدہ جعفر کے بزرگوں میں تھے۔

سیدہ جعفر کثیر التصانیف ادیبہ ہیں ان کو اردو نثر نگاری پر مکمل دسترس حاصل تھی ان کا طرز نگارش بے حد سلیس، بصیرت افروز، سنجیدہ اور عالمانہ ہوتا ہے۔تحقیق وتنقید ان کا خاص میدان رہا وہ تحقیق وتنقید میں گہرائی، غور وخوض اور فنی نزاکتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں جس موضوع

پر بھی وہ لکھتی ہیں اس سے ان کے گہرے شعور کا پتہ چلتا ہے۔

'ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ' ان کی پہلی مطبوعہ کتاب ہے جو 1960 میں مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوئی۔ اپنی پی ایچ ڈی کے دوران جب وہ اردو مضمون کا ارتقاء کے حوالے سے تحقیق کررہی تھیں تو انھوں نے ماسٹر رام چندر کے حوالے سے کئی اہم انکشافات پیش کیے جس کے نتیجہ میں یہ بات بھی واضح ہوئی کہ سرسید سے پہلے ہی سے انھوں نے مضمون نگاری شروع کی تھی چنانچہ موضوع کی اہمیت کو سامنے رکھ کر انھوں نے مزید کام کو آگے بڑھاتے ہوئے ماسٹر رام چندر کی حیات وخدمات پر ایک جامع کتاب علاحدہ طور پر تصنیف کی۔ اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا حصہ حالات زندگی اور ان کی تصانیف کے جائزہ پر مشتمل ہے اور دوسرے حصہ میں مضامین کا انتخاب موضوع کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے ماسٹر رام چندر اور ان کے کارناموں کے مطالعہ کی اہمیت سے متعلق سیدہ جعفر رقم طراز ہیں:

''ماسٹر رام چندر کے مضامین کا مطالعہ تاریخ ادب کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے ان کی تحریریں جدید اور قدیم نثر کی درمیانی کڑی ہیں ان کا اسلوب سادہ اور رواں ہے، اور اس میں نثری قدروں سے زیادہ معنوی حسن پر زور دیا گیا ہے۔ ماسٹر رام چندر کی تحریر میں نئی زندگی کی آہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ ان کی عبارتیں مشینی دور کی آمد کا احساس دلاتی ہیں، جب سماجی زندگی گہما گہمی اور کشمکش تیز ہوچکی تھی اور ادیبوں، انشاپردازوں کو فرصت کاروبار شوق میں کمی کا احساس ہونے لگا تھا اور اسی احساس نے نثر کو سادہ اور فطری انداز عطا کیا تھا۔ رام چندر نے اردو نثر کو اسلوب سے روشناس کیا۔ میں نے ماسٹر رام چندر کو اردو کے بلند مرتبہ انشاپردازوں کی صف میں نہیں لاکھڑا کیا ہے لیکن ان کے صحیح مقام کا تعین کرنے کی کوشش ضرور کی ہے''۔

''اردو مضمون کا ارتقا 1950 تک'' نامی یہ کتاب دراصل پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جس میں انھوں نے اپنی تحقیقی ژرف نگاہی اور دیدہ وری سے اس تحقیقی مقالہ کو امتیاز بخشا ہے اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ اردو کی پہلی تصنیف ہے، جس میں اردو مضمون نگاری کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے اور مضمون وانشائیہ کے فرق کو واضح کیا ہے ان کا یہ مقالہ بہت طویل تھا لیکن اس کو مختصر کر کے 1972 میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔

اسی طرح 'کلیات محمد قلی قطب شاہ' سیدہ جعفر کا شاہکار کارنامہ ہے۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ کو پہلے محی الدین قادری زور نے ترتیب دیا تھا، سیدہ جعفر نے مزید اپنی تحقیقی دیدہ وری سے دلائل کی روشنی میں بھاگ متی کے واقعہ سے اختلاف کیا ہے، ڈاکٹر زور اگرچہ پہلے مرتب کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن سیدہ جعفر نے اپنی تحقیقی بصیرت سے محمد قلی قطب شاہ کی دو غزلیں اور بارہ نظمیں شامل کر کے پھر سے اس کو شائع کرانے کی کامیاب کوشش کی اور 281 صفحات پر تفصیلی مقدمہ لکھ کر مسعود حسین خاں جیسے ادیب شہیر کی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی چنانچہ محمد قلی قطب شاہ کی مشہور غزل 'پیا باج پیالہ پیا جائے نا' کو قدیم اردو جلد دوم، ص:402 میں غواصی سے منسوب کیا گیا تھا، لیکن سیدہ جعفر نے اس کلیات کو از سر نو مرتب کر کے اس غلطی کی اصلاح کا کارنامہ انجام دیا۔

'دکنی رباعیات' بھی سیدہ جعفر کی ایک اہم تصنیف ہے ویسے رباعی کا فن بڑا مشکل ہوتا ہے اس موضوع پر بڑی محنت اور عرق ریزی سے سیر حاصل گفتگو کی ہے اور دکنی شاعروں کی رباعیات کو یکجا کر کے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

'من سمجھاون' یہ بھی ایک تحقیقی تصنیف ہے تامل ناڈو کے ایک اہم شاعر شاہ تراب کی طویل نظم ہے جو ترجمہ شدہ ہے۔ شاہ تراب کے حوالے اور ان کی خدمات کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی تھی لیکن انھوں نے ان کی حیات وخدمات پر سیر حاصل گفتگو کر کے ان کی علمی فتوحات کو منظر

عام پر لانے کی پوری کوشش کی ہے۔ مسعود حسین خاں نے 'من سمجھاون' کے پیش لفظ میں سیدہ جعفر کی تحقیقی و ادبی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

شعبہ اردو (جامعہ عثمانیہ) کی جانب سے اہل نظر کی خدمت میں ایک قیمتی تحفہ اور علمی چیلنج پیش کرتا ہوں۔

عموماً اردو میں خواتین نے شعر و شاعری، نثر نگاری، ناول نگاری، افسانہ نگاری اور دوسری اصناف میں اپنی عظمت و انفرادیت کا لوہا منوایا ہے، لیکن تحقیق و تنقید میں بہت کم خواتین نے اپنی عظمت کا سکہ منوایا ہے جب کہ سیدہ جعفر کی بات ہی اور ہے انھوں نے اپنی تحقیقی و تنقیدی بصیرت سے ادبی شہ پاروں کی بازیافت کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار بھی ممتاز محققین و نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف دکنیات پر مہارت رکھتی تھیں بلکہ مختلف اصناف پر گہری نظر تھی۔ اردو زبان کے علاوہ فارسی، عربی، ہندی، سنسکرت، مراٹھی اور انگریزی پر بے پناہ دسترس حاصل تھی، انگریزی ادب کے نئے رجحانات اور تحریکات پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔

پروفیسر صاحبہ نے صرف ہندوستان میں شہرت حاصل کی بلکہ بیرون ممالک میں بھی ان کی خدمات کو سراہا گیا۔ بیرون ممالک کے مختلف کانفرنسوں اور سیمینار میں شرکت کر کے بہترین مقالے پیش کیے اور ہندوستان کا نام روشن کیا۔ وہ اردو زبان کے تحفظ و فروغ کے لیے ہمیشہ فکر مند اور کوشاں رہتی تھیں۔ لندن کے سفر کے دوران انھوں نے ''رالف رسل'' سے انٹرویو لیا تھا جس میں رالف رسل نے اپنے اظہار خیال کے دوران یہ بات کہی تھی:

''اردو ہندوستان میں ہمیشہ زندہ رہے گی کیوں کہ یہ عوام کی زبان ہے اور عوام ہر دور میں ناقابل تسخیر ہے اور ان کی زبان ہر قیود و بند سے آزاد ہوتی ہے۔ رسل نے آکسفورڈ میں طالب علموں کو اردو سکھائی اور انہیں اردو زبان سے خاصا لگاؤ تھا۔''

پروفیسر سیدہ جعفر کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف مختلف انجمنوں اور اکیڈمیوں نے کیا ہے۔ ان کو بہت سے انعامات و اعزازات سے نوازا گیا ہے جن میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، نوائے میر ایوارڈ، مخدوم ادبی ایوارڈ، بیسٹ اردو رائٹر ایوارڈ اور عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ جیسے باوقار ایوارڈ سے بھی نوازی گئیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سیدہ جعفر نے تحقیق و تنقید کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں، بڑے بڑے ادبا اور محققین نے ان کے علمی، ادبی و تحقیقی کارناموں کا اعتراف کیا ہے، تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید میں بھی ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

غرض تنقید ہو یا تحقیق انھوں نے اپنی محنت شاقہ سے اردو ادب کی بے لوث خدمات انجام دی ہیں ان کا اہم کارنامہ 'اردو ادب کی تاریخ 1700 تک' ہے جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اس کتاب کو سیدہ جعفر نے اردو ادب کے مشہور محقق اور استاد گیان چند جین کے ساتھ مل کر لکھا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ کو بڑے ہی سلیقے اور سادہ سلیس انداز میں لکھ کر یقیناً ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔ مجموعی طور پر پروفیسر سیدہ جعفر کی ادبی خدمات اس قدر زیادہ ہیں کہ انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے، اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام نامی زندہ و تابندہ رہے گا۔

□□□

Dr. Md Ishtiyaque Ahmed
Lachhanpur
Post Bochgoan, Via Kasba
Distt Purnia-854330 (Bihar)

تانیثیت اور اردو افسانہ

ڈاکٹر تسنیم فاطمہ

لفظ Feminism فرنچ زبان کا لفظ ہے، لیکن بعض اہل قلم کے مطابق یہ لاطینی لفظ Femena سے مستعار ہے اور اب انگریزی زبان میں مخصوص اصطلاح کے طور پر رائج ہے۔ Feminism کا خاص مقصد عورتوں کی فلاح و بہبود ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ Feminism وہ اصول ونظریہ جس کے تحت معاشرہ میں عورتوں کے بہتر وجود کا اقرار کرنا ہے۔ Feminism کے تعلق سے سید محمد عقیل رقم طراز ہیں:

> ''تانیثیت ایک فلسفہ فکر اور ایک تحریک ہے۔ صرف عورتوں کے ذریعے تخلیق کئے جانے والے ادب کو شاید ہم تانیثیت کا نام دے سکتے ہیں۔ کم از کم اس تانیثیت کا نام جو ایک ادبی Idealogy کے ساتھ منظم ڈھنگ سے اپنے اصول وضوابط کے ساتھ چل رہی ہے۔''

(تانیثیت ایک تنقیدی تھیوری، سید محمد عقیل، ص-44)

مختصر یہ کہ خواتین افسانہ نگاروں کو جہاں معاشرے سے جڑے مختلف مسائل نے متاثر کیا وہیں عورتوں کی محرومی و بے بسی نے بھی انھیں اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ تانیثیت کے زیر اثر بہترین افسانے قلم بند کریں۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ تانیثیت کے زیر اثر خواتین نے افسانے لکھ کر اپنے نظریے کو تقویت بخشی۔ یہ سلسلہ ابتدا تا حال قائم ہے۔

اس سلسلے میں رشید جہاں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ افسانہ ''دلی کی سیر'' میں آپ کا ذہنی رویہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ آپ پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جنھوں نے بے خوف ہو کر اپنی بات کو پیش کیا یا یوں کہیں کہ صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ رشید جہاں نے ''دلی کی سیر'' کے حوالے سے ان رسم و رواج کے خلاف آواز بلند کی ہے جن کی وجہ سے عورتوں کی زندگی وبال جان بن چکی تھی۔ ساتھ ہی عورتوں کی جہالت عورتوں پر مردوں کی بالا دستی جیسے متعدد مسائل پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ ''دلی کی سیر'' کے علاوہ ''ساس بہو'' اور ''بے زبان'' افسانے بھی اسی زمرے میں آتے ہیں جن میں باغیانہ رنگ اور انقلابی فکر دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ وہ فکری سرچشمے ہیں جن سے رشید جہاں اس معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتی تھیں جہاں مرد اور عورتوں کے مابین کوئی حد فاصل نہ ہو۔ آپ کی افسانہ نگاری کے سلسلے میں علی احمد فاطمی فرماتے ہیں:

> ''اب تک اردو افسانے میں ناگفتنی تھی۔ گھریلو بول چال کی اس زبان کے سہارے رشید جہاں نے اسے گفتنی بنا دیا .... بعد میں اسی روایت کو عصمت، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، صدیقہ بیگم، رضیہ سجاد ظہیر اور دوسری افسانہ نگار خاتون نے آگے بڑھایا، لیکن اس میدان میں رشید جہاں بہرحال اس کی پیش رو کہی جائیں گی۔''

(تحریک نسواں اور اردو ادب، علی احمد فاطمی، ص-147)

تانیثیت کے حوالے سے عصمت چغتائی کے افسانے بھی خاص

اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنے افسانوں میں معاشرے میں پھیلی بدعنوانی عورتوں کے کھوکھلے وجود اور ان کی نفسیاتی کیفیت کو مرکزیت عطا کی ہے۔ مطلب یہ کہ عصمت نے سماج کے کریہہ چہرہ کو اپنے افسانوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس دیکھیے :

''عصمت کو روایتی عورت سے سخت نفرت ہے۔ عورت کا شوہر پرست ہونا وفاداری کا ایک طرفہ پہلو ہے۔ وہ عشق و محبت کے صحت مند نظریے کی قائل ہیں۔''

(خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں عورت کا تصور، شکیل احمد خاں، ص-240)

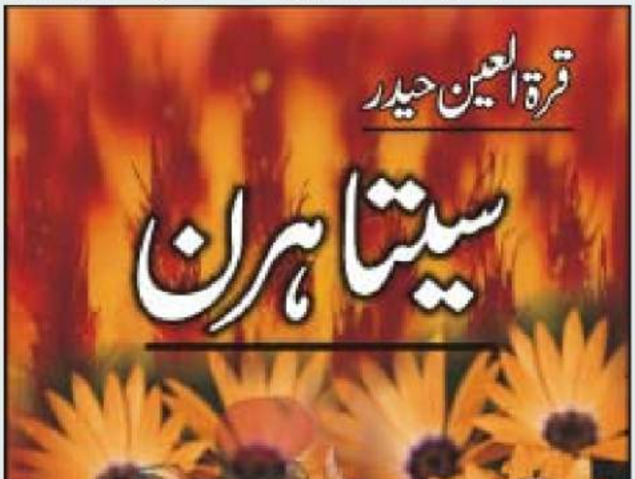

اس سلسلے میں افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس افسانے میں عصمت نے عورتوں کی بے بسی اور مردوں کی بالادستی کو افسانوی کردار کبریٰ اور رحمت کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ کبریٰ دلہن بننے کی حسرت لیے دنیا سے رخصت ہوجاتی ہے، لیکن رحمت کی زندگی اور ذہن کو اس حادثے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے ''حسب نسب''، ''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو''، ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، ''آوارہ گرد''، ''سیتاہرن'' وغیرہ بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ان افسانوں میں نسوانی کرداورں کو خلق کیا ہے جو اپنی ذہانت کے بل بوطے صحیح اور غلط کا فیصلہ کرتی ہیں۔ مختصر یہ کہ قرۃ العین حیدر نے ان نسوانی کرداروں کے ذریعہ عورتوں کی گنگ زبان کو قوت گویائی بخشی ہے۔ اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے:

''قرۃ العین حیدر کے فکشن کے نسوانی کردار نہ تو مردانہ جوروستم کے خلاف بغاوت بلند کرتے ہیں اور نہ اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے مظالم کا رونا روتے ہیں۔ پھر بھی اس نوع کے کرداروں کی فنکارانہ پیش کش نسوانی طرز احساس ونسائی صورت حال کو زیادہ موثر انداز میں قاری پر منکشف کردیتی ہیں۔''

(قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ، ارتضیٰ کریم، ص-167)

جیلانی بانو کے افسانے بھی تانیثیت کی پیشکش کے حوالے سے بہترین کہے جائیں گے۔ آپ اپنے افسانوں کے حوالے سے کردار اور سماج کی آویزش کو مخصوص انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اس سلسلے سے آپ کا تحریر کردہ افسانہ ''ستی ساوتری''، ''موم کی مریم''، ''مٹی کی گڑیا''، ''دیوداسی'' اور ''پیاسی چڑیا'' خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ جیلانی بانو ایسے نسوانی کرداروں کو خلق کرتی ہیں جو سماجی استحصال کا شکار ضرور ہوتی ہیں، لیکن اپنے حقوق کے لیے صدائیں بلند کرنا جانتی ہیں۔ اس تعلق سے جیلانی بانو خود فرماتی ہیں:

''شاید اسی لیے میرے دل میں اس لڑکی کے لئے بڑی عقیدت تھی جو پہاڑوں کی کھوہ میں چھپی اپنے حقوق کی لڑائی جیت رہی تھی .... وہ لڑکی میرے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ وہ جواں ہمت کنواری لڑکی جو رسموں روایتوں سماج اور مذہب کے سپاہیوں سے بیک وقت نپٹ رہی تھی۔ وہ Ideal لڑکی میرے خیالوں میں بس گئی تھی۔''

(نقوش آپ بیتی نمبر، جیلانی بانو، ص-126)

خواتین افسانہ نگاروں کی صف میں ترنم ریاض کا نام بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ تانیثیت کے حوالے سے آپ کا تحریر کردہ افسانہ ''تعبیر'' اہمیت کا حامل ہے۔ اس افسانے میں ترنم ریاض نے ایک لڑکی کی جدوجہد کی کہانی بیان کی ہے۔ یہ لڑکی ایک سرکاری اسکول میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتی ہے اور بہت سارے بچوں کے دلوں میں وہ گھر بنا لیتی ہے، لیکن ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر جب اس لڑکی کا دوسرے علاقہ کے اسکول میں ٹرانسفر کا اعلان کرتی ہیں تو وہ لڑکی اس ٹرانسفر کو روکنے کے لیے اسکول کے ڈائرکٹر سے ملنے کے لیے

اسسٹنٹ سے رابطہ کرتی ہے، لیکن جب اسسٹنٹ اسے بری نظروں سے دیکھتا ہے تب وہ لمحے بھر کے لیے گھبرا کر استعفیٰ دینے کا فیصلہ کرتی ہے، لیکن فوراً ہی یہ ارادہ کرتی ہے کہ:

''وہ بزدلوں کی طرح میدان نہیں چھوڑے گی چاہے کتنا بھی وقت لگے وہ لڑے گی اپنی پاکیزگی کو ڈھال بنا کر وہ اپنی جنگ خود لڑے گی اس نے استعفیٰ پھاڑ دیا۔''

(جدید خواتین افسانہ نگار نظریہ اور تجزیہ، صالحہ زریں، ص-78)

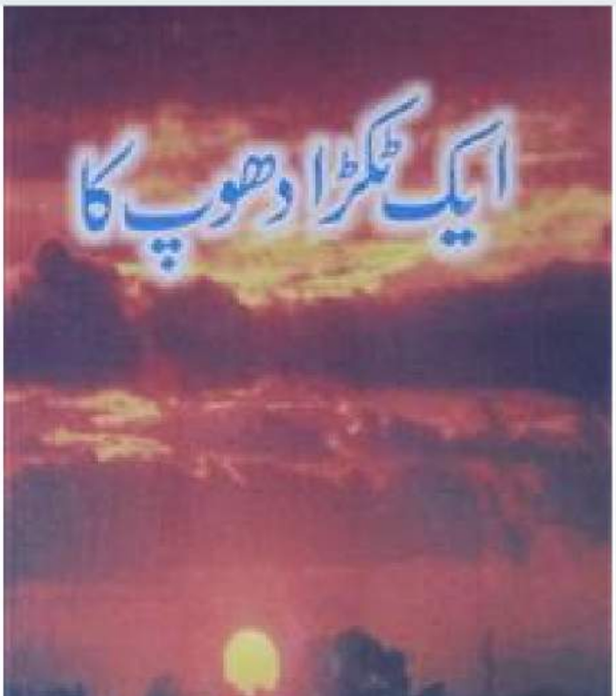

ترنم ریاض کا یہ افسانہ اپنی تلخ حقیقتوں کے ساتھ تانیثی رجحان کو بھی فروغ دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ ترنم ریاض کے افسانوں کی نسوانی کردار تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ نامساعد حالات کا مستعدی کے ساتھ سامنا کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کرداروں کی جدوجہد ہمیں زندگی جینے کا شعور بھی سکھاتی ہے۔

افسانوی ادب کے عصری منظرنامے پر غزال ضیغم کا نام بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آپ کا افسانوی مجموعہ ''ایک ٹکڑا دھوپ کا'' 2000 میں شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔ تانیثیت کے حوالے سے افسانہ ''سوریہ ونشی، چندرونشی'' بھی خاصہ اہم ہے۔ روحی خان اس افسانے کی مرکزی نسوانی کردار ہے۔ جس کا تعلق زمیندار گھرانے سے ہے۔ وہ تمام قیدو بند سے آزاد ہو کر وکالت کی ڈگری لینے کے لیے ہاسٹل میں رہ کر پڑھنا چاہتی ہے۔

روحی خان تعلیم حاصل کرنے کے دوران آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی لیڈر بن جاتی ہے اور اس طرح وہ اپنے حقوق کی باتیں کرنا بھی سیکھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بڑے بھائی اقبال سے یہ سوال کرنے پر آمادہ ہے کہ:

''حق...... یہ ابھی سے حق کی بات کرنے لگیں جانتی بھی ہو لڑکیوں کا کوئی حق نہیں ہوتا؟ اقبال بھیا بگڑے...... یہ میں کیسے مان لوں کہ لڑکیوں کا کوئی حق نہیں ہوتا؟ یہی جاننے کے لئے تو میں قانون پڑھوں گی۔''

(جدید خواتین افسانہ نگار نظریہ اور تجزیہ، صالحہ زریں، ص-220)

غزال ضیغم نے روحی کو ایک ایسا نسوانی کردار بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے جو اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرنا چاہتی ہے۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد وہ وجے سنگھ سے شادی کر لیتی ہے یہ اس کا انقلابی قدم ہوتا ہے۔ اس افسانے میں مصنفہ نے مرد کے مقابلے عورت کے کردار کو مضبوط بنا کر پیش کیا ہے۔ جس طرح روحی کا کردار روشن خیال ہونے کے ساتھ ساتھ قوت فکر اور قوت ارادی کی بھی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ غزال ضیغم نے عورت کی روشن خیالی کو سامنے لانے کے لیے مردوں کے لیے بغض کا اظہار کیا ہے بلکہ عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے مثبت نظریہ کو بروئے کار لائی ہیں۔

اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے:

''غزال نے اپنے افسانوں میں عورتوں کو مختلف عادات، خصلتوں، بدکاریوں، خودغرضیوں کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہیں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ عورتوں کے فکر میں مثبت تبدیلی آرہی ہے انھوں نے براہ راست شکایت کرنے سے بہتر سمجھا کہ ایسے کردار ابھارے جائیں جو کسی بھی عورت کی ذات کے قابل مثل ہو۔ تہذیب کی حدوں کو پھلانگنے سے گریز کیا۔ مردوں کے خلاف بھی بغض سے بھرا لہجہ نہیں ملتا ہے۔ جواب روایت کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔''

(سوونیئر اردو فکشن میں خواتین کی خدمات، اگست 2013، ص-102)

غزال ضیغم نے عورتوں کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھتے ہوئے کئی

بہترین کہانیاں لکھی ہیں جن میں بھولے بسرے لوگ، بے دروازے کا گھر، زندہ آنکھیں مردہ آنکھیں اور نیک پروین ہیں آپ کے نظریہ حیات کو سامنے لانے میں یہ تمام کہانیاں معاون و مددگار نظر آتی ہیں۔

ثروت خان کا افسانوی مجموعہ ''ذروں کی حرارت'' 2004 میں شائع ہوکر دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ ''میں مرد مار بھلی'' عورتوں کے جذبات ونفسیات کو پیش کرتا ہے۔ مصنفہ نے افسانے کی نسوانی کردار کیرتی کے ذریعہ عورتوں کی باغیانہ کیفیت کو پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیرتی کی دوست سنبل جب اپنے شوہر کے ظلم کو برداشت کرتی ہے اور کیرتی کی مخالفت پر شوہر کی حمایت میں کھڑی ہوتی ہے تب کیرتی کے اندر احتجاجی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے ثروت خان نے یوں پیش کیا ہے:

> ''داخلیت ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ وجود کے لاتعداد ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اس کارواں رواں اس ناانصافی کے خلاف احتجاج کرنے پر آمادہ تھا۔''

(جدید خواتین افسانہ نگار نظریہ اور تجزیہ، صالحہ زریں، ص-176)

اس افسانے کی نسوانی کردار کیرتی انصاف کی طلب گار ہے اور مردانہ محبت کی آہنی زنجیروں سے چھٹکارا بھی پانا چاہتی ہے۔ مختصر یہ کہ افسانہ ''میں مرد مار بھلی'' عورتوں کی نفسیاتی جدوجہد کی کہانی کو بیان کرتا ہے۔

مذکورہ بالا خواتین افسانہ نگاروں کے علاوہ صادقہ نواب سحر، آشا پربھات، صوفیہ انجم تاج، پروین شیر، ذکیہ مشہدی، قمر جہاں، اشرف جہاں، کہکشاں انجم، نوشابہ خاتون، عنبری رحمان وغیرہ نے بھی مخصوص معاشرے کی نہایت مظلوم عورت کو ایک نئی معنویت کے ساتھ ابھارا ہے اور استحصال نظام اور تفریق سے بھرے ہوئے سماج کی تابع عورت کی کمزوری اور حالات کی ستم ظریفی کو اس کی نارسائی اور پسپائی کے حوالے سے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ مختصر یہ کہ خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں میں تانیثیت کی پیشکش کے حوالے سے عورتوں کو خانگی اور سماجی سطح پر بہتر مقام دلانے کی بہترین کوشش کی ہے۔

❑❑❑

Dr. Tasneem Fatma
D/O Md. Tahir Hussain
Sadar Gali, Bagh Kalu Khan
Party Gali, Patna City
Patna-800008 (Bihar)

سہ ماہی 'فکر و تحقیق' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا علمی وتحقیقی جریدہ ہے۔ اس کا ارتکاز تحقیقی موضوعات اور مباحث پر ہے۔ اس میں کلاسیکی ادب، عالمی ادبیات، معاصر ادبی تحریکات و رجحانات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ علمی اور ادبی حلقوں میں یہ مجلہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

سہ ماہی 'فکر و تحقیق' اکتوبر-دسمبر 2020 کے مشمولات کی جھلکیاں:

- اردو افسانے کے تین دور/ حمید سہروردی
- مثنوی 'داستان گل سخن' اور بلوان سنگھ راجہ بنارس/ سید سجاد مہدی حسینی
- کالی داس گپتا رضا کی غالب فہمی/ حنا آفریں
- حکیم منظور کی شاعری کشمیر کے ماحولیاتی تناظر میں/ عرفان عالم
- عربی رسم الخط کا آغاز و ارتقا/ فرحان انصاری
- اردو میں منظوم ڈرامائی نقوش کا مطالعہ/ صالحہ صدیقی
- تلفارمس کی شناخت کا مسئلہ/ محمد حنیف خان

قیمت: فی شمارہ 25 روپے **زرسالانہ:** عام ڈاک سے 100 روپے، رجسٹرڈ ڈاک سے 200 روپے

رابطہ— شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

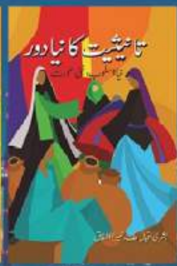

مہوش نور

جرمنی کی نمائندہ خواتین افسانہ نگار

یورپ کا ایک اہم حصہ جرمنی ہے۔ جرمنی میں اردو ادب کے فروغ کے لیے متعدد شخصیات کوشاں ہیں۔ جرمنی میں ہائڈل برگ یونیورسٹی کا شعبۂ اردو اپنی منفرد خدمات کی وجہ سے ہمیشہ توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اردو کی اہم شخصیات ہائڈل برگ یونیورسٹی، شعبۂ اردو سے وابستہ رہی ہیں۔ میونخ یونیورسٹی سے علامہ اقبال کی یادیں وابستہ ہیں۔ انھیں کی وجہ سے اردو داں افراد اس یونیورسٹی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جرمنی کی دیگر یونیورسٹیوں میں بھی اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کا اہتمام ہے۔ جرمن قوم میں کرسٹینا اردو زبان و ادب کے حوالے سے موجودہ دور میں منفرد مقام رکھتی ہیں گو کہ ڈاکٹر کرسٹینا اب سبکدوش ہو چکی ہیں تاہم ان کی ادبی خدمات کئی دہائیوں پر محیط ہیں۔ جرمنی میں مقیم اردو زبان و ادب کے شیدائی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں مرد و خواتین دونوں کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ نمائندہ تخلیق کاروں میں عارف نقوی، سرور غزالی، انور ظہیر رہبر، سید اقبال حیدر، عشرت معین سیما، ہما فلک، کائنات بشرا اور بشریٰ اقبال ملک وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس مضمون میں جرمنی کی نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں کا ذکر ہے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جرمنی میں مقیم خواتین افسانہ نگاروں پر بحث و مباحثے کا دور شروع ہو جائے گا۔ نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں کی فہرست میں عشرت معین سیما، کائنات بشیر، بشریٰ اقبال ملک اور ہما فلک کا نام قابل ذکر ہے۔

ہما فلک، جرمنی کی کہانی کار، معاصر کہانی کاروں سے مختلف ہیں۔ ہما فلک ایک عرصے سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ انھیں اردو زبان و ادب سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔ ہما فلک کا ایک مشہور افسانہ ''ایوارڈ'' ہے۔ اس افسانہ میں ہما فلک نے ایک تخلیق کار کو موضوع بنایا ہے وہ تخلیق کار شاعر بھی ہو سکتا ہے افسانہ نگار، ناول نگار اور ادیب بھی۔ ساتھ ہی اس بات پر بھی تخلیق کار کی توجہ مبذول کرائی ہے کہ ہم زندگی کے جن تلخ حقائق کو اپنی تخلیقات کا موضوع بناتے ہیں، تخلیقات کی ذمہ داری یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ سماجی سطح پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اس کہانی میں ایسی ایک شاعرہ کی روداد بیان کی گئی ہے جس نے اپنی نظم میں ایک غریب اور بے بس ماں کی کہانی بیان کی تھی جس نے بھوک اور فاقے سے تنگ آ کر اپنے بچوں کو زہر ملی ہوئی روٹی کھلا کر اور خود بھی کھا کر خودکشی کر لی تھی جس پر اسے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا اور وہ بہت خوش تھی۔ فلک نام کی یہ شاعرہ ملک کے سب سے بڑے ایوارڈ کی حقدار قرار پائی تھی۔ اسے مسلسل مبارکباد کے فون آ رہے تھے اور وہ ہنس ہنس کر سب سے مبارکباد وصول کر رہی تھی۔ گھر آتے ہی اس نے سب سے پہلے فیس بک پر ایوارڈ کی چند تصاویر یں شیئر کیں۔ اپنے ایوارڈ کی مبارکباد فیس بک پر وصول کرتے کرتے کب سو گئی

اسے پتہ ہی نہیں چلا۔

خواب میں شاعرہ کے جواب میں وہی عورت جس پر اس نے نظم لکھی تھی۔ اس کے چار بچے سفید لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں جن کے چہرے پر طمانیت اور گہرا سکون تھا جن کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے اور وہ انہیں اپنی طرف بڑھتا دیکھ خوفزدہ ہو کر پوچھ رہی تھی تم لوگ کون ہو؟ اور کیا چاہتے ہو؟ عورت نے جواب میں کہا:

''ہم وہ ہیں جن کی وجہ سے تمہیں اپنی زندگی کے سب سے بڑے خواب کی تعبیر ملی ہے اور اب تم ہمیں نہیں پہچان رہی؟''

''کون سا خواب کیا تعبیر؟ کیا باتیں کر رہے ہو تم لوگ؟'' وہ واقعی نہیں جانتی تھی یا انجان بن رہی تھی۔''

(ہما فلک، روح دیکھی ہے کبھی، ص 189)

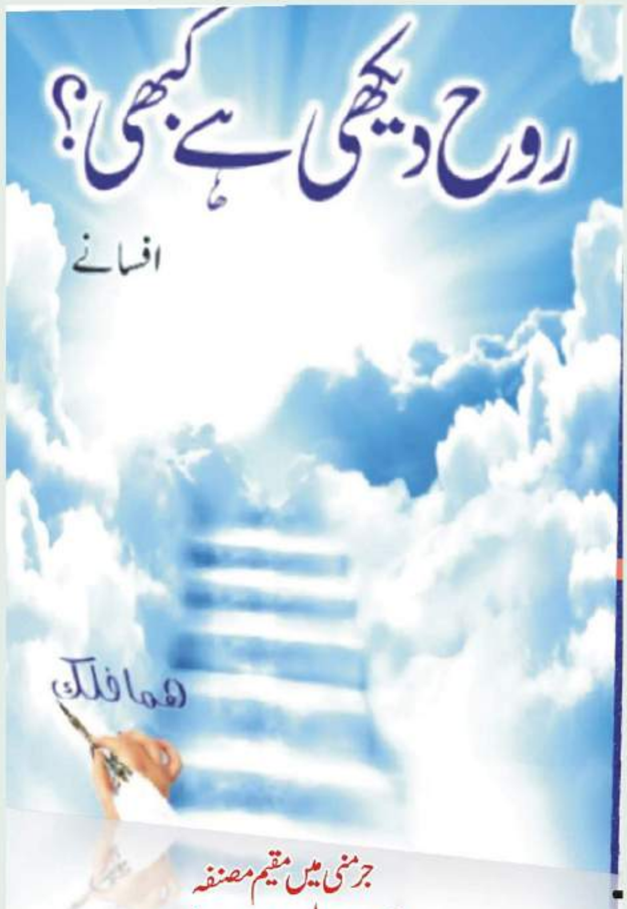

فلک شاعرہ کے پوچھنے پر اس عورت نے بتانا شروع کیا جس دن تم ہماری موت پر گھر آئی تھی اس سے ایک رات پہلے میں نے اپنے بچوں کو تسلی دی تھی کہ اب ہمیں کوئی دکھ اور کوئی پریشانی نہیں ہوگی اب ہم کبھی بھوکے نہیں رہیں گے جس کی خوشی میں میرے بچوں نے زہر ملی ہوئی روٹی کو بڑی خوشی سے کھالیا تھا۔ اگلے دن تم ہم سب کی موت پر افسوس کرنے آئی تھی اور ساتھ ہی اپنی شاہکار نظم بھی سوچ چکی تھی۔ میں تم سے ایک سوال پوچھتی ہوں، ہماری خودکشی سے تمہیں شہرت اور ایوارڈ تو مل گیا لیکن میرے جیسے کتنے لوگوں کو آج بھی ایک وقت کی روٹی میسر نہیں تم جیسے شاعر اور ادیب ہماری خودکشی اور ہماری قبروں کے عوض کتنے ایوارڈ حاصل کرو گے؟ فلک کی گھبراہٹ کی وجہ سے آنکھ کھل گئی تو خود کو اس نے پسینے میں شرابور پایا۔

ہما فلک کا ایک دوسرا افسانہ 'زنجیر' ہے۔ ہما فلک نے ''زنجیریں'' میں ایک ایسے شخص کی زندگی اور اس کی قربانیوں کو موضوع بنایا ہے جو اپنے گھر، ماں اور بہنوں کو بہتر زندگی، آرام وسکون دینے کے لیے اپنی محبتوں کو قربان کر دیتا ہے اور پوری زندگی اپنے گھر والوں کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ عثمان اس کہانی کا مرکزی کردار ہے جو ایک محنت کش اور وفادار بیٹا اور بھائی کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ کہانی کار نے اس کردار کو سماجی نفسیات کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ اس طور پر یہ کردار حقیقت سے زیادہ بناوٹی لگنے لگتا ہے۔ گھر بار کی ذمہ داری ایک الگ مسئلہ ہے تاہم اپنی ذاتی زندگی بھی ہر فرد کے لیے بہت عزیز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس افسانے کے اختتام پر تھوڑی سی تشنگی محسوس ہوتی ہے کہ عثمان ماں سے علیحدہ ہو جاتا ہے کیوں کہ اس پر بہن اور اس کے دو بچوں کی ذمہ داری آ جاتی ہے۔ میرے خیال میں علیحدگی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اختتامی حصے میں ان کی یہ کہانی کمزور معلوم ہوتی ہے۔

افسانہ ''اگر'' دلچسپ مکالموں پر مشتمل ایک اچھا افسانہ ہے۔ اس میں ایک ایسے شادی شدہ جوڑے کے گھر کے ماحول کو پیش کیا گیا ہے جنھیں ازدواجی زندگی میں بندھے دو سال گزر چکے ہیں اور اب میاں بیوی میں پیار کی جگہ تکرار نے لے لی ہے۔ اس افسانے میں پیش کیے گئے مکالمے نہایت فطری ہیں اور ان کی برجستگی و بے ساختگی قابل ستائش ہے۔ ہما فلک نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ''ہلدی والی، وقت سے پرے، ببول، دی وِش وے، سچا، مسرت، تلاش، وفادار، وہ لمس، دلداری، ایک ادھوری کہانی، خزاں موسم کے گلاب، کاسہ باز، آخری پیغام، حرف اختتام اور ابدی موت'' وغیرہ ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔ جن میں انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کا ذکر تفصیلی طور پر کیا ہے۔ ساتھ ہی تمام افسانوں کے موضوعات بہت متنوع ہیں۔ کینوس بھی کافی وسیع ہے۔ امید ہے کہ نئی بستیوں کے لکھاریوں میں ہما فلک ایک نمایاں شناخت کے ساتھ جانی پہچانی جائیں گی۔

جرمنی میں مقیم کائنات بشیر بیک وقت شاعرہ، فکشن نگار اور سفرنامہ

نگار ہیں۔کالم،انشائیہ،مزاح نگاری،افسانہ،مضامین،خاکہ نگاری اوراردو ادب کی دیگر اصناف پر بھی آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ ادب کی ان اصناف پرشائع شدہ آپ کی تحریریں کافی پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔آپ کی تحریروں میں وطن سے محبت اوراردوزبان سے انسیت موجود ہے۔

کائنات بشیر کی مختلف اصناف پر کئی کتابیں بھی منظر عام پر آ چکی ہیں۔پہلی کتاب ''چانداور صحرا'' (افسانے اور دلچسپ تحاریر) 2013 میں شائع ہوئی۔2018 میں مائیکروفکشن پر مشتمل کتاب ''رمزۂ ادراک'' (مختصر افسانے) شائع ہوئی۔2019 میں کائنات بشیر کی تین کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ''خاموش نظارے (سفر نامہ)''، آئینوں کا شہر (افسانے)،اورافسانوں کی ایک کتاب ''دلگدازتحریریں'' بھی شائع ہو چکی ہیں۔شاعری کی ایک کتاب ''چند لمحے'' اشاعت کے مرحلے میں ہے۔ ''شام کتنی اداس ہے، یاد تو آتی ہوگی نا اوراب بھی ساون برستا ہوگا'' (شاعری) یہ تینوں کتابیں ای بک کی صورت میں شائع ہوکر پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔آپ آن لائن اردواخبارات کے لیے مسلسل لکھتی رہتی ہیں۔آپ کا ایک سفرنامہ ''عمرے کاٹکٹ'' زیرتکمیل ہے۔

کائنات بشیر کی ایک کہانی ''آج کی رات پیا'' ہے۔یہ کہانی بیانیہ انداز میں لکھی گئی ہے۔اس میں ایک ایسی شادی شدہ عورت کی روداد ہے جوشوہراورسوتن کی مار جھیل رہی ہے۔شوہر سے اس لیے پریشان ہے کہ وہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتا ہے اورشوہر کی دوسری بیوی ظاہر ہے کہ رقیب ہی ہوگی۔کائنات بشیر کی یہ کہانی، کہانی کے فن پر پوری نہیں اترتی ہے۔اس میں کہیں بھی کہانی پن نہیں ہے۔اس لیے اس کو کہانی کہنا تو دور ایک مختصر بیانیہ بھی نہیں کہہ سکتے ،ہاں فنی طور پر ناقص اور بیانیہ طور پر ایک ناکام کہانی کہہ سکتے ہیں۔کائنات بشیر کی دوسری کہانی ''رفیق سفر'' ہے۔اس کہانی میں کائنات بشیر نے سفیان نامی شخص کی زندگی کے نشیب وفراز کو پیش کیا ہے۔اس کہانی میں سفیان کی بیوی مبارکہ کی گود خالی رہنے کی وجہ سے لعن طعن برداشت کرتی ہے اورآخرکارایک دن گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے اس وجہ سے سفیان ذہنی ہیجان کا شکار ہوجاتا ہے۔یہ کہانی بھی ایک غیر دلچسپ کہانی ہے۔کہانی کے نام پر چند صفحات رنگین ضرور کیے گئے ہیں تاہم کہانی پن سے موصوفہ کی دونوں کہانیاں خالی ہیں۔ان دونوں کہانیوں کے پس منظر میں کہا جاسکتا ہے کہ کائنات بشیر کاتخلیقی سفر جاری ہے۔اس لیے ان سے مستقبل میں امیدیں وابستہ ہیں۔

بشریٰ اقبال ملک کاتعلق یوں تو پاکستان سے ہے لیکن جرمنی میں ایک لمبے عرصے سے مقیم ہیں اوراب جرمنی ہی ان کا وطن ثانی ہے۔بنیادی طور پر بشریٰ اقبال ملک افسانہ نگار ہیں۔اب تک دوافسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔''مجمعے کی دوسری عورت'' اور''حیات نو یافتہ'' اور ایک کتاب ''تانیثیت کا نیادور(نیا اسلوب،نئی عورت)'' قابل ذکر ہے۔ان کے افسانوں کے زیادہ تر موضوعات پاکستانی معاشرے اوران کی سوچ، پاکستانی عورت کی زندگی کے نشیب وفراز اوراس کے سامنے درپیش مسائل جیسے موضوعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ان کی اکثروبیشتر کہانیوں کا محورعورت ہے۔بشریٰ اقبال ملک کی ایک کہانی ''مجمع کی دوسری عورت'' ہے۔اس کہانی میں اس سماج کوموضوع بنایا گیا ہے جہاں مردوں کوعورتوں پر برتری حاصل ہے۔یہ وہ سماج ہے جہاں معاشرے میں کوئی شگاف ہوتا ہے یا مرد بے راہ روی اختیار کرتا ہے تواس کا موردالزام عورتوں کوٹھہرادیا جاتا ہے کہ معاشرے میں تبدیلی اورمردوں کی بے راہ روی کی ذمہ دار آج کل کی بے پردہ عورتیں ہیں۔ساتھ ہی ساتھ اس تنگ نظر سماج میں سانس لے رہی عورتوں کے مسائل کوبھی موضوع بنایا گیا ہے کہ عورتوں کوایسے سماج میں کس طرح کے مسائل درپیش ہوتے ہیں،کس طرح انہیں پابندیوں اور بندشوں میں رکھا جاتا ہے اور جب کوئی عورت یہ بندشیں توڑ کر اپنے حق کے لیے آواز بلند کرتی ہے،تو یہ سماج اس کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرتا ہے اور کیسی کیسی اذیتیں دیتا ہے۔اس کہانی میں ان ہی تلخ حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔یہ کہانی عورت پر ہونے والے ظلم کے خلاف ایک طرح سے احتجاج ہے۔

بشریٰ اقبال ملک کی کہانی ''گونگا اورفرعون'' میں ہندستان کی تقسیم اورتقسیم کے باعث سیاسی،معاشی،اخلاقی،مذہبی،سماجی،تہذیبی،ذہنی ہرسطح پر ہونے والی تبدیلیوں کوموضوع بنایا گیا ہے۔تقسیم کے ساتھ اس افسانے میں ہجرت کے دردوکرب کوبھی موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس کہانی کا مرکزی کردارایک گونگا بابا ہے۔بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اس نے تقسیم کے بعدقیام پاکستان کے حالات ومسائل کا سامنا کیا۔

گونگابابا کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ہندستان کی تقسیم سے اس محلے میں موجود ہے۔جو بلاناغہ تہجد کے لیے آنے والوں کے لیے مسجد اور وضو کی صفائی کرنے کی ذمہ داری جانے کب سے نبھارہا تھا تقسیم سے پہلے یہ محلّہ برہمنوں کا محلّہ کہلاتا تھا۔یہ محلّہ بھی لوٹ ماراورآتش زنی کا شکار ہوا تھا۔یہاں کے لوگ وہاں اور وہاں کے لوگ یہاں آئے،یہاں آنے والوں کو پانچ چھ سال کا یہ گونگا بچہ ایک جلے ہوئے گھر کے ملبے کے پاس ملا تھا۔یہاں کا ہر فرد درد میں مبتلا تھا کسی کے پاس اتنی فرصت کہاں تھی جو گونگے بچے سے اس کا نام،اس کا خاندان یا اس کا مذہب پوچھتا۔گاؤں محلے سے کھانا مانگ کر اپنا پیٹ بھر لیتا تھا۔جب بڑا ہوا تو مسجد کے عقبی

دیوار کے پیچھے اپنی ایک چھوٹی جھونپڑی کو اپنا گھر بنالیا۔تب سے اس نے مسجد کی دیکھ بھال کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی۔گویا یہ کہانی برصغیر کی سیاسی،سماجی اور معاشرتی ڈھانچے کی اردگرد گھومتی ہے۔

بشریٰ اقبال ملک کی کہانیاں خواتین کے مسائل،حدود و قیود پر مبنی ہیں مثلاً ''کیا کریں، جوئے شیر،اور مجمع کی دوسری عورت'' وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں ہندو پاک کی تقسیم سے پیدا شدہ حالات و مسائل اور ہجرت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں ''تحفظ،سوال، آسمان نمبر سات، جنت کی حقیقت، کرما، حصار،خودی کا بوجھ،تجربہ،داستان گزیدہ،یہ کیسی زندگی، بے نیازی کی نیاز، گرفت، ملامتی، لوح اور کاغذ، ترجیح، گڑھا،رسم دنیا، کارکن، احساس کے پار، آخری تارہ،المیہ،کشتی تیار کرلو،کشش اور کم تر'' وغیرہ ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔''گونگا اور فرعون'' اسلوب ، ہیئت، زبان و بیان کے اعتبار سے بہترین افسانہ ہے۔ جنگ اور سیاسی اتھل پتھل اور سیاست لیڈران کا ذکر وغیرہ پڑھتے وقت افسانہ کم اور تاریخ کا زیادہ گمان ہوتا ہے۔میرے خیال میں جنگ اور سیاسی ہلچل کا مختصراً ذکر ہوتا تو یہ افسانہ اور بھی دلچسپ اور مسحور کن ہوتا ۔ تاریخ کی طوالت نے افسانے میں کہانی پن کو ضرور مجروح کیا ہے۔بہر کیف! جرمنی کی نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں کی کہانیوں کے پس منظر میں کہا جاسکتا ہے کہ اردو افسانہ جرمنی میں ایک دلچسپ اور پسندیدہ صنف بن کر ابھر رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ لکھنے والوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے، یہ اضافہ یقیناً ایک خوب صورت اور خوش آئند علامیہ ہے۔

❑❑❑

Mahwash Noor
Room No 142, Shipra Hostel
Jawaharlal Nehru University
New Delhi-67

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................. بتاریخ..................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 :IFSC: SYNB0009009، A/C

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

محمد رکن الدین

پروین شیر کا سفرنامہ

'چند سیپیاں سمندروں سے'

پروین شیر کا سفر نامہ 'چند سیپیاں سمندروں سے' اردو کی نئی بستیوں کا ایک اہم اور کامیاب سفر نامہ ہے۔ اس کی اشاعت 2014 میں ہوئی۔ پروین شیر نے اس سفر نامے کا انتساب ان الفاظ میں خوب صورت مصوری کے ساتھ درج کیا ہے۔ 'ان بے چین آنکھوں کے نام جن کی جھیلوں پر خوابوں کے سفینے رواں ہیں'۔ 'چند سیپیاں سمندروں سے'، اس سفر نامہ میں سفر نامہ نگار نے دنیا کے دو براعظم کا ذکر کیا ہے۔ اول 'سیاہ روشنی' اس عنوان میں جنوبی افریقہ کی سیر و سیاحت درج ہے۔ دوم 'طلسمی جہاں' اس میں پیرو، ساؤتھ امریکہ کا ذکر ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ داہنے جانب اردو رسم الخط میں تقریباً 236 صفحات پر مشتمل اردو زبان میں افریقہ اور امریکہ کی سیر و سیاحت کی روداد ہے۔ اس کے بعد انھیں دونوں ملکوں کی سیر و سیاحت کی داستان انگریزی میں بھی موجود ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سفر نامہ اردو اور انگریزی دونوں زبان کی چاشنی سے بھرپور ہے۔ اس سفر نامے کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ سفر نامہ نگار یعنی پروین شیر نے جدید آلات کے استعمال سے گریز کرتے ہوئے اپنی آرٹ یعنی فنِ مصوری سے کتاب کو آراستہ کیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پروین شیر کی حسی قوت کتنی متحرک ہے۔ ایک بہترین سفر نامہ نگار کے ساتھ 'چند سیپیاں سمندروں سے' میں ہم ایک خوب صورت آرٹ یعنی فنِ مصوری سے بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

پروین شیر، یوں تو اردو کی نئی بستیوں میں کئی اعتبار سے قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ آپ ایک باذوق شاعرہ، بہترین مصور ہیں اور ان کا منفرد سفرنامہ ان کی ادبی داستان کا گواہ ہے۔ ادبی ذوق و شوق رکھنے والے احباب اور اردو کے قدآور ناقدین نے ان کے شعری جہاں کو خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے۔ 'چند سیپیاں سمندروں سے' پر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے دونوں حصوں پر فرداً فرداً بات کی جائے۔ اول 'سیاہ روشنی' یعنی جنوبی افریقہ کے ذیلی عنوان میں 42 عناوین شامل ہیں۔ جس کی فہرست کچھ یوں ہے:

''جسم و جاں پرواز میں، طیارے میں دنیا، بوڑھا درد، کیپن، تلخیاں، وہ گلیاں (سویٹو Soweto)، وہ آنکھیں، احتجاج (نظم)، سوال، وقت سے پرے، قوت (نظم)، بے چینیاں، مختلف رنگ (نظم)، فالسئی قباؤں کا شہر اور اٹھتے سورج کی زمین، خدا کی کھڑکی، خوشیوں کی ندی، دیارِ سکون (سوآزی لینڈ)، لانبے ناخن (نظم)، دائرِ تشدد، شیشے کا جہاں، موسم کی دنیا، ٹھہرے ہوئے وقت کا جہاں، ٹرڈمل، دیار جمال (کیپ ٹاؤن)۔ طرب انگیز (ٹیبل ماؤنٹین)، دیار ایذا (روبن جزیرہ)، سلاخیں چیختی ہیں (نظم)، سیاہ روشنی (نظم)، منڈیلا (نظم)، گونجتی خاموشیاں (ڈسٹرکٹ 6 میوزیم)، دو دروازے (نظم)، دریدہ (نظم)، درد آگیں تخلیقات، نور کے اندھیرے، وہ دنیا، درد کے بھاری پتھر، گرتی

ہوئی دیواریں، دیارِ قزح (ملائی کو آرٹرس)، راس امید، سمندری پرندے، پس اندیشی، گونجتی خاموشیاں (نظم)۔"

طلسماتی جہاں (پیرو، ساؤتھ امریکہ) کے زیرِ عنوان درج ذیل عناوین ہیں:

"جہانِ ابر، یادِ ایام، سرساحل (لیما)، آسماں کے قریں (پونو)، رفتہ، کیرولینا، نابینا بینا (نظم)، دیارِ نغمہ و رقص، پانیوں پر تیرتے ہوئے گھروندے، حیرت کدہ، جھیل پر تیرتے ہوئے گھروندے (نظم)، دنیا سے پرے دنیا، سورج کے بیٹے کی سرزمین (کوسکو)، کوسکو کا دل، وقت کے غار میں، دھنک راستے، پل (نظم)، صدیوں پرے، لاما اور الپاکا کی دنیا، پس زندگی، جیت، بل کھاتی ندی، وادیوں میں، بے چین لہریں، دھاگوں سے بندھی ہوئی داستان، کائناتی زبان، ایک ہی رنگ، اسرار و طلسمات، بادلوں سے آگے، پہاڑوں کے جنگل میں، ارخ و سما کا بندھن، نرالی دیواریں، ماچو پیچو کے باغبان، تین دنیائیں، پانی کے آئینے میں ستارے، پہلی کرن، زندہ پتھر، خواب کدہ، خواب زار (نظم)، لمحات سراسیمگی، آخری رات، تجریدی، تجریدی آرٹ نظم)، ذہن کا ضدی بچہ، تجسس (نظم)۔"

ان عناوین کے علاوہ ایک طویل فہرست مصوری کی بھی ہے جس میں فنِ مصوری کی خوب صورت نمائش کے ساتھ پروین شیر کے اعلیٰ ذوق کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ ادیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ادیب سماج میں رہ رہے دیگر افراد سے زیادہ حساس و متحرک ہوتا ہے۔ سماجی مسائل پر ایک ادیب کی رائے ایک دانشور سے بھی اہم ہوتی ہے۔ پروین شیر کے ساتھ ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ کہنہ مشق ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین مصور بھی ہیں جو ادبی احساسات و جمالیات کی جانچ پرکھ میں چار چاند لگاتا ہے۔ سیاہ روشنی یعنی جنوبی افریقہ کا سفر، اس سفرنامے کی روداد قلم بند کرتے ہوئے پروین شیر نے 'جسم و جان پرواز میں' کا عنوان قائم کیا ہے۔ پروین شیر جہاز کے اڑان کے ساتھ افریقی ممالک میں بس رہے سیاہ فام کی تاریخ کے سیاہ باب میں کھوئی ہوئی پائی جاتی ہیں، سیاہ فام کا مطلب ہی ظلم و ستم، نسلی امتیاز اور تیسری دنیا کے لوگ ہیں، اس خیال کی بانی سفرنامہ نگار نہیں ہیں بلکہ سفید فام اقوام ہیں جنھوں نے ان گنت ظلم و ستم سیاہ فام کے لیے وضع کر رکھے تھے جسے روشنائی کی جگہ قلم کار نے آنسو اور ہمدردیوں کا لبادہ پہنا رکھا ہے۔

ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے نقشے پر افریقی عوام کی کیا صورت حال ہے:

"سفاک دلوں کے بے رحمانہ سلوک کی سچی کہانیاں اس کی زندگی کے حسین رنگوں کو دکھ کے سیلاب میں بہا دیتی تھیں۔ جھرجھری سی آجاتی تھی یہ سن کر کہ سفید فام ہاتھوں میں پھولوں کی نرمی تھی اور سیاہ فام ہاتھوں میں پتھر کی سختی۔ سفید پیکر سیاہ جسموں کی سیڑھیوں کے سہارے بلندی کو چھو لیتے تھے اور زخمی سیاہیاں پاتال میں گر جاتی تھیں۔ آج اسی سرزمین کی طرف طیارے کی بانہوں میں وہ سمٹتی ہوئی جا رہی تھی۔ جہاں جانے کی تمنا برسوں سے تھی جہاں سیاہ فام زندگیوں کے لیے انسانی حقوق کے سب دروازے بند کر دیے گئے تھے۔"

(پروین شیر، چند سیپیاں سمندروں سے، ص نمبر:53)

افریقہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ افریقہ ایک ملک میں ایک دنیا آباد ہے جو مختلف رنگوں کا سنگم ہے۔ صنفِ سفرنامہ خالص تجربات پر مبنی ہوتا ہے جس میں سفرنامہ نگار اس ملک کی جغرافیائی خدوخال، بود باش، رہن سہن، سماجی و سیاسی امور پر تبادلۂ خیال کرتا ہے ساتھ ہی اس ملک کی خوب صورتی، اچھائیاں اور اس طرح کے دیگر تجربات بیان کرتے ہیں جس سے دوسروں کو سیاحتی خواہشات کی ترغیب ملتی ہے۔ ایک کامیاب اور بہترین سفرنامہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس ملک کی قلمی روداد اور تاریخی اوراق پر مشتمل ایسی تحریر ہوتی ہے جس سے پوری دنیا واقفیت حاصل کرتی ہے۔ اس لیے سفرنامہ نگاروں کے لیے ضروری ہے کہ جہاں کا بھی سفر کرے اور کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو تحقیقی حس کو ہمیشہ زندہ رکھ کر قلم اٹھائے۔ پروین شیر اس جانب کامیاب نظر آتی ہیں۔ افریقی تاریخ پر گہری نظر کے ساتھ افریقی جغرافیہ سے بھی باخبر ہیں۔

سفرنامے کی زبان یوں تو سفرنامہ نگار کے اسلوب پر منحصر ہے تاہم آسان، صاف و شفاف زبان کے ساتھ اگر بیانیہ مربوط ہو تو قاری کے لیے مزید آسانیاں اور دلچسپی برقرار رکھنے میں معاون ہوتا ہے۔ 'چند سیپیاں سمندروں سے' کا مطالعہ آسان زبان اور مربوط بیانہ کے اعتبار سے قابل داد ہے لیکن غیر ضروری عناوین قاری کے ذہن کو کچھ بوجھل کر دیتے ہیں۔ اگر پروین شیر ہر صفحہ پر عنوان درج کرنے کے بجائے تجربات قلم بند کرتیں تو تحریر شگفتہ و شیریں ہو جاتی۔ باوجود اس کے واقعات کے بیانیہ میں کہیں بھی قاری کو بھٹکنے نہیں دیتیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک کامیاب سفرنامہ ہے۔

سفرنامہ کا اسلوب تنقیدی یا تحقیقی مضامین کی طرح بوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ سفرنامہ میں تخلیقی جولانیت کارآمد اور مفید ثابت ہوتی ہے۔ 'چند سیپیاں سمندروں سے' میں بھی قاری افسانوی انداز سے لطف اندوز

ہوتے ہیں۔حقیقت پسندی سفرنامہ کی پہلی شرط ہے۔افسانوی انداز سے پرے،ہم یہاں دیکھنے کی کوشش کررہے ہیں کہ پروین شیر،نے اپنے سفر نامہ میں حقیقت پسندی کو کتنی جگہ دی ہے؟افریقہ جانے کے پیچھے کیا اسباب تھے؟افریقہ کا تصور حساس انسان کو کتنا پریشان کرتا ہے؟ان پر،پروین شیر کے تاثرات جاننے کے لیے ایک اقتباس درج ہے۔اس اقتباس میں پروین شیر کا بیانیہ دیکھیے:

''ناول روٹس پڑھنے کے بعد پہاڑ جیسے پروین کے ذاتی مسئلے ایک ذرے میں تبدیلی ہوگئے تھے۔اور پھر۔۔۔جب Aparthied کا خوف ناک چہرہ سامنے آیا تھا تو یہ ذرہ بھی معدوم ہوگیا تھا۔ اپنا آپ گم ہوگیا تھا۔ طاقت کا گھناؤنا استعمال اور کمزوروں کا کچل دیا جانا۔۔۔یہ سب کچھ پڑھ کر، سن کر وہ پگھل کر مظلوم کے آنسو بہنے لگی تھی۔وہ ہر پسی ہوئی روح میں سانس لینے لگی تھی اور تب اس کا دل اس سرزمین کو دیکھنے کو بے چین سا ہوگیا تھا۔ جہاں یہ تشدد قانوناً رائج تھا۔ جہاں Aparthied کا زہر پھیل چکا تھا وہاں جانا چاہتی تھی جہاں کی درختوں، ندیوں، پہاڑوں، آبشاروں اور ہواؤں نے اس درد کو محسوس کیا تھا اور دیکھا تھا۔وہ انہیں چھوکر محسوس کرنا چاہتی تھی۔ وہی درد ہواؤں پر لکھی ہوئی کہانیاں پڑھنا چاہتی تھی۔ درختوں کی سرسراہٹ میں نہاں داستاں سننا چاہتی تھی۔ندی کی لہروں میں گھلے ہوئے درد کے رنگ دیکھنا چاہتی تھی۔''(ایضاً،ص نمبر55-56)

Alex Haley کا ناول روٹسRoots کی دردناک داستان سے پروین شیر بہت متاثر ہوئیں جس کا برملا اظہار بھی مذکورہ اقتباس میں دیکھ سکتے ہیں۔پروین شیر اس سفرنامے میں کہیں کہیں اپنے تجربات سے سماجی اصلاح کا بھی کام لیتی دکھائی دیتی ہیں۔مثلاً امریکہ میں سیاہ فام سے لوگ بہت خوفزدہ رہتے ہیں،ان کی آبادی میں جانے سے لوگ کتراتے ہیں لیکن افریقہ پہنچ کر سیاہ فام نے جس طرح والہانہ استقبال کیا،برسہابرس کی خوفنا کی نے ایک منٹ میں پروین شیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ سیاہ فام وحشی نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کا دل موم کی طرح ہوتا ہے۔امریکہ میں سفید فام کی زیادتی نے سیاہ فام کو متشدد بنا کر رکھا ہوا ہے کیوں کہ وہاں وہ لوگ اپنی بقا اور تحفظ کے لیے جدوجہد کررہے ہیں۔ظاہر ہے جس قوم پر نسلی اور مذہبی امتیازات کی مہر لگادی جاتی ہے ان کے رویے میں تشدد ایک ناگزیر رویہ بن جاتا ہے۔ پروین شیر نے امریکہ میں بسنے والوں کے لیے ایک پیغام بھی دے دیا کہ سیاہ فام کا اخلاق وکردار کسی سے کم درجے کا نہیں ہے۔ بلکہ افریقہ میں پہنچ کر ایک سفید فام امریکی سے سفرنامہ نگار صرف اس لیے متنفر ہے کہ قافلے کے گائیڈ کینن سے بدسلوکی کی تھی، بدسلوکی صرف اس لیے کہ اس کی من پسند وین کا انتظام کینن نہیں کرسکا تھا۔'وہ گلیاں'یعنی سوئیٹو جس کا مطلب ہوتا ہےSouth Western Township۔

فالسئی قباؤں کا شہر اور اٹھتے سورج کی زمین (Prectoria and Mpumalanga)اس عنوان کے تحت وین پری ٹوریا کی سیر کا ذکر ہے۔ وین پری ٹوریا جوہانس برگ سے تیس میل کی دوری پر ہے۔اسی راستے میں 1873 کی قائم کردہ یونیورسٹی ہے۔راستے میں ایک چھوٹا سا شہر وِٹ بینک ملا۔کینن نے اس کے بارے میں یہ بتایا کہ چرچل یہاں دورانِ جنگ قیدی تھا۔لیکن فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔اس نے ایک مکان پر دستک دے کر مدد مانگی تھی۔ اس گھر کے مالک جون ہاورڈ Jhon Howardنے دروازہ کھولا اور چرچل کو 6دنوں تک تہہ خانے میں چھپا کر رکھا تھا۔ یہ واقعہ انگریزوں اور ڈچ کے زمانے کا تھا۔جب چرچل صحیح سلامت اپنے گھر پہنچ گیا تھا تو اس نے شکریہ کے خط کے ساتھ 6عدد سونے کی قیمتی گھڑیاں جون ہاورڈ کو بھیجی تھیں۔اپنی جان بچانے کا انعام۔

شہر وِٹ سے متصل ایک قصبہ تھا اس کے متعلق کینن نے بتایا کہ یہاں کے لوگ اچھے فنکار ہوتے ہیں اس قبیلے میں لوگ آج بھی اپنی پرانی تہذیب کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔اس قبیلے کا نامNdebele ہے۔ یہاں لوگ اپنے گھروں کو گہرے رنگوں میں رنگتے ہیں۔زمین اور گھر کے برتن بھی عورتیں رنگین بناتی ہیں۔یہاں کی عورت جس کا نام Esther Mhlanga ہے مشہور فنکارہ ہے۔ایک ان پڑھ عورت نے چالیس سال کی عمر میں مصوری شروع کی اور آج باسٹھ سال کی عمر میں اپنے عروج پر ہے۔اتنی پسند کی جانے لگی کہ جرمنی نے 1994 میں اسے دعوت دی کہ جرمنی آکر فنِ مصوری سکھائے۔وین ایک چھوٹے سے قصبے سے گزر رہی تھی جس کا نام بل فاسٹ (Belfast) تھا۔ یہ قصبہ 1890 میں رچرڈ اونیلRechard Oniel نامی شخص نے تلاش کیا تھا۔یہ جگہ سیاہ گرے نائیٹ اور سرد موسم کے لیے مشہور ہے۔پانچ ہزار آبادی والا خوب صورت قصبہ جوہانس برگ سے آٹھ سو میٹر نیچے ہونے کی وجہ سے سرد تھا۔ہر طرف چھوٹی چھوٹی دوکانیں قطاروں میں تھیں۔عورتیں گہرے رنگ کے روایتی لباس میں سر پر گٹھری اور پیٹھ پر بچہ لیے ہوئے چل رہی تھیں۔پروین نے غور کیا کہ کینن جب بھی اپارٹ ہائیڈ کے تشدد کی باتیں کرتا تھا تو اس کے چہرے پر غم بھی ہوجاتا اور غصہ بھی،جب بغاوت کی باتیں کرتا تو ایک جوش

میں ڈوب کر، جب ملک کی آزادی اور اپنے لیڈر منڈیلا کا ذکر کرتا تو فخر کے نشے میں چور ہوکر۔ پروین اس کے چہرے کی بدلتی رنگت دیکھ کر خود بھی جذباتی ہوجاتی تھی۔

سیاحوں کا قافلہ Mpumalanga کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وین کی کھڑکی سے خوب صورت نظارے آ رہے تھے۔ لال مٹی میں مکئی کے کھیت اور سورج مکھی بھی لہلا رہے تھے۔ پوملا نگا(Mpumalanga) مقامی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'اٹھتے سورج کی زمین' کے ہیں۔ اس زبان کا نام سس واتی(Siswati) ہے۔ یہ ساؤتھ افریقہ کا سب سے نیا سب سے ترقی پذیر صوبہ ہے۔ یہاں دنیا کا سب سے قدیم غار، کھنڈرات، پہاڑ اور افریقہ کی سب سے Vibrant اور مختلف روایتوں کا سنگم ہے۔ یہیں ہیرے کی کان کا 1905 میں علم ہوا تھا۔

'خدا کی کھڑکی، خوشبو کی ندی کی' سیر پر پروین نے اظہار خیال کیا ہے۔ Blyde River Canyon افریقہ کا سب سے بڑا اور دنیا کا تیسرا بڑا(Canyon) آب درہ ہے۔ یہ آب درہ سولہ میل اونچا اور آٹھ سو میل گہرا ہے۔ 'دیار سکون' یعنی(Kurger National Park) کی سیر ہے۔ یہ پارک 1898 میں بنایا گیا تھا جو بیس ہزار اسکوائر میٹر سے بھی زیادہ پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں تقریباً سارے حیوانات، پرندے، کیڑے اور نباتات پائے جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس پارک میں سولہ سو شیر، پچیس ہزار بھینس اور بارہ سو چیتے ہیں۔ اس پارک میں پانچ قسم کے حیوانات بے حد اہم مانے جاتے ہیں۔ ان میں شیر، چیتا، رینو(Rhino)، بھینس اور ہاتھی قابل ذکر ہیں۔ 'دیار تشدد' یعنی سوآزی لینڈ کا ذکر، سوآزی لینڈ جو Southern Hemisphere کا سب سے چھوٹا ملک ہے۔ اس ملک میں ایک بادشاہ کی حکومت ہے۔ جس کا نام مسواتی 3 ہے۔ اس کی ماں Ndlovakazi ہے جس کے معنی " She elephant"(مادہ ہاتھی) کے ہیں۔

'شیشے کا جہاں، موم کی دنیا' کے بعد سب سے دلچسپ عنوان 'ٹھہرے ہوئے وقت کا جہاں' یعنی(Kingdom of the Zulu) میں ذولو گاؤں کا ذکر ہے۔ ذولو گاؤں حقیقی افریقین کی زندگی سے سمیٹے ہوئے اپنی کہانی بیان کر رہی تھی۔ ذولوگاؤں سیارہ نما گاؤں جو دنیاوی گاؤں سے مختلف تھا۔ اس گاؤں کی بناوٹ پتھر کا زمانہ یاد دلا رہا تھا۔ اس گاؤں میں قیام پذیر باشندے ترقی یافتہ دنیا سے بالکل ناواقف تھے۔ گاؤں کے اندر داخل ہونے کے لیے لکڑی کا خاص دروازہ تھا۔ اندر جانے سے پہلے اجازت لینی ضروری تھی۔ بغیر اجازت اندر جانا منع تھا۔ لکڑی سے بنے ہوئے ایک کمپاؤنڈ کے اندر گول پھوس کے بنے ہوئے جھونپڑے تھے۔ مرد کا جسم نیم برہنہ تھا، ایک کمپاؤنڈ میں تقریباً بیس جھونپڑے تھے۔ کچھ عورتیں درخت کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی موتیوں کے ہار اور دوسرے زیورات بنا رہی تھیں۔ کچھ عورتیں اوکھلی میں مکئی کوٹ رہی تھیں۔ اسی طرح کی مزید زندگیاں دیکھ کر پروین کچھ غمزدہ تو کچھ مسرور ہو رہی تھیں۔ 'دیار جہاں' یعنی(Cape Town) کیپ ٹاون کی کچھ قابل ذکر چیزوں میں مشہور ٹیبل ماؤنٹین اور اٹلانٹک سمندر ہیں۔ ٹیبل ماؤنٹین اس سیارۂ زمین پر سب سے زیادہ Spritual مقامات میں سے ایک ہے۔ یہ پہاڑ جسے ٹیبل ماؤنٹین اس لیے کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ بالکل ٹیبل کی شکل کا ہے۔ 1086 میٹر سمندری سطح سے اونچا، طویل پہاڑ ہے جواب دنیا کے ایک عجوبہ کی شکل میں جانا جاتا ہے۔ یہ ریت اور پتھروں کے Erosion سے تقریباً چار سو پچاس ملین سال کے بعد وجود میں آیا۔ اس پر سفید بادل ایسے لگ رہے تھے جیسے میز پر سفید ریشمی میز پوش بچھا ہوا ہو۔ یہ ٹیبل ماؤنٹین سینکڑوں کلو میٹر دور سے ایٹلانٹک سمندر سے نظر آتا ہے۔ ہمالیہ سے تقریباً 6 گنا پرانا ہے۔ گلیشیئرز(Glaciers) نے تراش خراش کر کے اسے ایک انوکھی شکل دے دی تھی۔ کیپ ٹاؤن کے باشندوں کے لیے یہ شہر کا دل اور روح ہے۔ تاریخی پس منظر میں اس پہاڑ کو ایک یوروپین نے سر کیا تھا جس کا نام Antonio de Saldanha تھا۔ اس شخص نے ہی اس انوکھے پہاڑ کا نام Table of the Cape رکھا تھا۔ پروین شیر نے مزید اس سفر نامے میں روبن جزیرہ، ڈسٹرکٹ 6 میوزیم، ملائی کو آرٹرس Cape of the Good Hope، Boulder Beach، لیما، پونو، کیرولینا پانیوں پر تیرتے گھروندے(Floting Island)، کوسکو(Cusco)، لاما اور الپا کی دنیا، پزاک (Pisaq)، Ollantaytambo، Urubamba، ماچو پیچو کے باغبان وغیرہ کے بارے میں کافی معلومات درج کی ہے۔ افریقہ اور پیرو، ساؤتھ امریکہ کی طرف سیاحت کا ارادہ رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک معلومات کا خزانہ ہے۔ امید ہے کہ اردو سفر نامے کی روایت میں پروین شیر کی اس کاوش کی پذیرائی کی جائے گی۔

□□□

Md Ruknuddin

Room No 312, Kaveri Hostel

Jawaharlal Nehru University

New Delhi-110067

رپورتاژ 'بھوپوشیما' ایک جائزہ

محمد انصر

'بھوپوشیما' اختر جمال کا ایک رپورتاژ ہے، جو گو کہ مختصر ہے تاہم دلچسپ انداز، افسانوی رنگ، عمدہ طرز بیان اور شیریں زبان سے لبریز ہے۔اس میں اختر جمال نے مالوہ کی ایک یونین کاربائیڈ یعنی گیس فیکٹری سے پیش آنے والے عظیم حادثے، دل خراش واقعے، دل دوز معاملے اور شہر آشوب المیے کی ایک پُر درد داستان کو افسانوی طرز اور جذباتی آہنگ میں پیش کیا ہے۔ساتھ ہی اس کے ذریعے قومی و مذہبی، ملکی و سماجی، مالی و معاشی اور جانی وجسمانی ہونے والی تمام تر تباہیوں اور نقصانات کو بھی بیان کیا ہے۔اس طرح یہ رپورتاژ ایک اَلم ناک دردانگیز بیان پر مبنی ہے۔

رپورتاژ نگار اپنی بہنوں کے ساتھ پکنک اور سیر وتفریح کے لیے بھوپال گئیں اور پھر یہیں سے سانچی گئی تھیں۔وہ عالم خیال ہی میں تیز گامی کی وجہ سے اپنی بہنوں سے دور چلی گئی تھیں اور زمانۂ حال کی قید و بند سے نکل کر ماضی کی بھیانک وادیوں میں اچانک پہنچ گئیں۔انھوں نے جن چیزوں کا مشاہدہ اور جن امور کا معائنہ کیا، ان کو ایک منفرد انداز اور اسلوب کی لڑی میں پرودیا اور رپورتاژ کی شکل میں مرتب کردیا۔اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ''بھوپوشیما'' اختر جمال کا ایک خیالی اور تصوراتی رپورتاژ ہے، جس میں انھوں نے عالم تخیلات میں جاکر سیر وتفریح اور اس میں پیش آنے والی باتوں کا کو ذکر کیا ہے، ساتھ ہی سانچی کے سب سے اونچے پہاڑ پر مہاتما بدھ کے مندر کا معائنہ، اس کے منقش در و دیوار اور اس میں متحرک چہروں کی حرکت خاص طور پر بدھ کی داسی یعنی نرتکی سے ملاقات وتعارف اور ان کے ہمراہ سانچی اور بھوپال کے مختلف مقامات کی تفریح اور دوران سفر ان سے ہوئے دلچسپ مکالموں اور سوالات وجوابات وغیرہ کو بڑی خوبی اور فن کاری کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اختر جمال نے رپورتاژ کا آغاز اور اس کے لکھنے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ایک جگہ تحریر کیا ہے:

''میں سب کے ساتھ پک نک پر گئی تھی اور پھر اکیلی اتنی دور نکل آئی۔شاید ان سب سے دور اس لیے بھاگی کہ وہ سب مجھے جال میں جکڑے تھے''۔

(سالنامہ نقوش لاہور، ص 255، شمارہ نمبر 133، ستمبر 1986ء-مدیر: جاوید طفیل)

اختر جمال نے اپنے رپورتاژ میں اصل واقعہ کے بیان سے قبل مقام سانچی میں واقع مہاتما بدھ کا مندر، اس کی عمارت، اس کی قدامت و کہنگی، اس کی وسعت وکشادگی، اس کے در و دیوار، اس کے نقش ونگار اور اس کے بانی وغیرہ کے بارے میں فراہم کردہ اپنی اہم معلومات اور مشاہدات رپورتاژ کی ابتدا میں تحریر کرتی ہیں:

''سانچی کے سب سے اوپر پہاڑ پر مہاتما بدھ کا وہ مندر ہے، جو اشوک نے بنوایا تھا۔اس مندر کی سب سے اونچی دیوار پر چڑھ کر میں نے اپنے اطراف ایک نظر ڈالی۔دیوار تقریباً

تین فٹ چوڑی تھی اور یہ عمارت بھی ان پہاڑوں کے سیاہ پتھر کی بنی ہوئی ہے اور ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی شکست وریخت سے ناآشنا کھڑی ہے"۔(ایضاً،ص255)

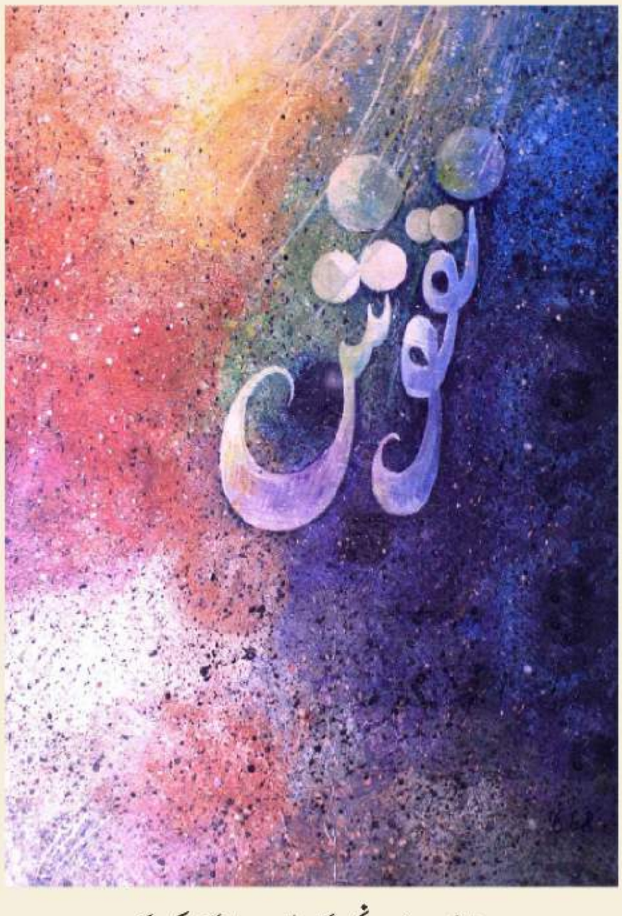

رپورتاژ نگار نے سانچی کے بلند پہاڑ کے ذکر کے بعد یہاں سے نظر آنے والے مختلف اہم مقامات اور تاریخی قصبات ومواضعات وغیرہ کی عظمت وتقدس دلچسپ پیرایے میں ہونے کے ساتھ مالوہ کی خوب صورتی، رائے سین قلعہ کی بلندی، وندھیا چل کے پہاڑوں کی رعنائی اور ان کے دامن سے جاری ہونے والی ندیاں، جھرنیں اور آبشاروں، بھوپال کی عظیم الشان مسجدوں کے بلند و بالا مینار یں، عیدگاہوں کی سفید عمارتیں اور سنگ سرخ سے بنی ہوئی تاج المساجد، برلا مندر کے سنگ مرمر کے حسن ودل کشی وغیرہ کا ذکر بھی بڑے اچھوتے اسلوب اور مسحور کن انداز میں کیا ہے۔

اختر جمال نے رپورتاژ میں سانچی کے اونچے پہاڑ پر واقع مہاتما بدھ کے مندر کا عمدہ تعارف کرایا ہے۔انھوں نے مندر کی عمارت و قدامت، اس کے دروازے کی خصوصیات اور ان میں بنے ہوئے نقش و نگار اور حرکت کرنے والے چہرے، مندر کی دیواریں اور یہاں سے نظر آنے والے اہم اور تاریخی خطے اور لطف اندوز مناظر ومظاہر اور نگاہوں کو خیرہ اور چکاچوند کرنے والی چیزوں کو نہایت عمدگی اور سلیقہ مندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اسی طرح مندر کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس میں سونے سے بنی ہوئی بدھ کی مورت کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس میں نصب کردہ ان کے اعضا و جوارح کی چند خصوصیات کو بھی واضح کیا ہے، جن سے بدھ کی شخصیت کا خاکہ اور ان کے کمالات کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہے۔ساتھ ہی انھوں نے اس میں سنگ تراش کی سنگ تراشی کی مہارت و کمال اور خدا کی قدرت وعظمت کا بھی ذکر کیا ہے۔چناں چہ رقم طراز ہیں:

"وہاں ایک بدھ کی سونے کی مورت بھی بنائی ہے اور پرانے مندر میں داخل ہوتے ہی بدھ کی وہ بڑی سی سیاہ پتھر کی مورت بھی بنائی ہے اور پرانے مندر میں داخل ہوتے ہی بدھ کی وہ بڑی سیاہ پتھر کی مورت نظر آتی ہے، جس میں وہ دونوں پیروں کو کنول صورت میں جوڑ کے بیٹھے ہیں اور اس میں پتھر کی آنکھیں اور بدھ کے بند ہونٹ بولتے ہوئے لگتے ہیں۔اس میں سنگ تراش کی محبت، محنت اور خدا کی قدرت سب چیزیں بول رہی ہیں"۔(ایضاً،ص256)

اس رپورتاژ میں شہر بھوپال کے قابل دید مقام اور دعوت نظارہ دینے والے تاریخی خطے"سانچی" کا بھی خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، نیز اس کے تعارف کے ساتھ اس کی اہمیت وخصوصیت کو عمدہ پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔محل وقوع کے اعتبار سے پہاڑ کی ڈھلان میں واقع اس خطہ کی رونق وشادابی اور اس میں موجود مختلف قسم کی جاذب نظر عمارتوں، پر کشش رہائشوں اور خوب صورت مکانات اور ان کے مکینوں یعنی ان میں اپنی زندگی گزر بسر کرنے والوں، تفریح گاہوں اور تعلیمی اداروں وغیرہ کو بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ساتھ ہی یہاں کے باشندوں کے اس خطے سے تعلق ولگاؤ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔چنانچہ رپورتاژ نگار ایک مقام پر تحریر کرتی ہیں:

"پہاڑ کی ڈھلان پر سانچی کا قصبہ ہے۔شان دار میوزیم، خوب صورت ریسٹ ہاؤس، اسکول، اسپتال اور گھروں کی عمارتیں ان سب رہنے والوں کا ان کے کالے سیاہ پہاڑوں سے گہرا رشتہ ہے۔ان کا کوئی نہ کوئی بزرگ بدھ کے زمانے میں ضرور سانس لے رہا ہوگا، اور شاید اشوک کے اس لشکر میں بھی شامل ہو جس نے لڑائی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی تھی اور پھر شاید بہت سے سپاہی سنگ تراش بن گئے ہوں"۔

(ایضاً،ص256)

اختر جمال نے اپنے رپورتاژ میں بدھ کی داسی نرتکی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ شروع سے اخیر تک نرتکی پورے رپورتاژ میں نمایاں ہے اور یہی اس رپورتاژ میں تنہا کردار کے طور پر نظر آتی ہے۔ اختر نے سب سے پہلے اس سے ملاقات کا پس منظر پھر اس کا تعارف کرایا اور اس کی خوبیوں کو بیان کرنے کے بعد اس کے اپنے پیچھے آنے اور پھر ان ہی کے ساتھ مختلف مقامات کی سیر کرنے اور اصل واقعہ اور حادثہ سے متعلق بات چیت وغیرہ کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چنانچہ اختر نرتکی سے ملاقات وتعارف اور اس کے ہمراہ مندر کی دیوار پر گفت وشنید وغیرہ کے بارے میں بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''اچانک میں نے اپنی گردن کے پیچھے ایک زندہ لمس محسوس کیا۔ مجھے گرم گرم سانس محسوس ہوئی۔ میں نے گردن موڑی تو اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور سیدھی کھڑی ہوگئی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ ''تم وہی نرتکی ہو''؟ میں نے سنگ مرمر کی لاٹ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا؟ وہ مسکرائی۔ ہاں! تم مجھے وہ نرتکی بھی کہہ سکتی ہو! میرے بہت سے نام اور زمانے ہیں۔ سنو! میں روپ متی تھی، میں کملا پتی تھی اور میں ہی شاہ جہاں بیگم اور سلطان جہاں بیگم تھی۔ مجھے ناموں میں مت ڈھونڈو، ورنہ میں کھو جاؤں گی، نام تو کپڑے ہیں جو ہر روز بولے جاتے ہوں۔ میں تو ایک روح ہوں۔ کسی بھی جسم میں سانس لے سکتی ہوں اور اس لمحہ تمہارے پاس آ گئی ہوں اور تمہارے جسم میں سانس لے رہی ہوں۔ اسی لیے تو تمھیں سب چیزیں زندہ نظر آ رہی ہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اُسے پہچان لیا، وہ مالوہ کی روح تھی۔ وہ جو میرے اندر بھی تھی اور باہر بھی۔ اس نے مجھ سے کہا: آؤ! اس مندر کی دیوار پر بیٹھ کر باتیں کریں''۔ (ایضاً،ص256)

رپورتاژ میں اختر جمال نے اس امر کا بھی اظہار کیا ہے کہ انھوں نے نرتکی سے مکالمہ کیا اور باتوں کے درمیان انھوں نے اس سے سوالات اور استفسارات کیے اور ان کی اہمیت وافادیت کے بارے میں نرتکی سنجیدہ بھی محسوس ہوئی، بلکہ وہ اختر کی باتوں کی تائید بھی کرتی ہے اور ان کے جذبات واحساسات کی قدر بھی۔ مثلاً نرتکی نے جب اختر سے گیس سے ہونے والے نقصانات اور تباہیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

''پھر تم مجھے بتاؤ! میری زمین پر وہ سوداگر کہاں سے آگئے جو زہر کی تجارت کرتے تھے؟ انھوں نے بیچ شہر میں کارخانہ کیسے لگایا؟ انھیں آنے سے روکا کیوں نہیں گیا؟''

(ایضاً،ص57-256)

تو اس کے جواب میں اختر یہ جواب دیتی ہیں:

''سنو! یہ سب سیاست کی باتیں ہیں، تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی......''۔ (ایضاً،ص258)

تو اب نرتکی اس جواب کی تائید وحمایت کرتے ہوئے کہنے لگتی ہے:

''تم سچ کہتی ہو۔ میری سمجھ میں یہ سب باتیں نہیں آ رہی ہیں۔ کیوں کیا؟ کیسے؟ ان سوالوں نے مجھے دکھی کر رکھا ہے''۔

(ایضاً،ص258)

اس طرح جمال اختر کے رپورتاژ میں عالم خیال میں نرتکی سے ملاقات ہو جاتی ہے، جو ایک اہم کردار کی حیثیت سے نظر آتی ہے۔ رپورتاژ نگار اس کے ہمراہ مختلف مقامات کی سیر وتفریح اور گیس سے ہونے والے واقعے کا مشاہدہ ومعائنہ کرتی ہیں اور پھر اسی میں ان کی سیر کا پورا وقت گزر جاتا ہے۔ اختر کو نرتکی اپنی آپ بیتی اور سرگزشت سے بھی روشناس کراتی ہے۔ بھوپال اور سانچی کے دینی ومذہبی مقامات اور تاریخی آثار کی زیارت کراتی ہے اور جس مقام یا خطہ سے گزرتی ہے، اس کا تعارف کراتے ہوئے اپنے تبصرے بھی پیش کرتی ہے اور تاریخ کی اہم معلومات سے آگاہ وباخبر کرتی ہے اور مختلف ادوار اور زمانوں میں ان جگہوں کی خوش حالیوں، خوب صورتیوں، صنعتی ترقیوں، مالی حالتوں وغیرہ کے بارے میں پرسکون انداز اور اطمینان بخش لب ولہجے میں داستان سناتی ہے۔ ساتھ ہی اختر کو اپنی سنائی باتوں اور بتائے گئے واقعات کو قلم بند کرنے کی تاکید وہدایت بھی کرتی نظر آتی ہے۔ اختر جمال سے نرتکی اپنے حسن وجمال کو دیکھنے وسمجھنے کے لیے انھیں متعدد چیزوں کی ہدایت کرتی ہے، ساتھ ہی سرزمین مالوہ سے اپنی وابستگی اور انسیت، اس کی اہمیت ورفعت اور پھر اس میں واقع دریائے بھوج کی عظمت ومرتبت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے بعد اس امر کا انکشاف بھی کراتی ہے کہ اپنے عہد وزمان کے ممتاز وباکمال اصحاب علم ودانش میں کون کون یہاں آئے اور اس کی جانب اپنی توجہات مبذول کی اور یہاں کی وادیوں سے لطف حاصل کرنے، ان کے خوب صورت مناظر سے مسحور ہونے وراپنے مطلوب ومقصود تک پہنچنے والوں کا بھی ذکر کرتے ہوئے ان کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ اختر جمال نرتکی کی باتوں کو نقل کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''اور اگر میرا حسن دیکھنا چاہو تو تم کالی داس کی شاعری پڑھو! میرا وہ سپوت اپنی جنم بھومی سے اتنا پیار کرتا تھا کہ پھر بعد میں

اگر کسی اور جنم لیا تب بھی مجھے کویتا سنانے ضرور آیا۔ کبھی فارسی میں، کبھی بنگالی میں، اور کبھی اردو میں اور یہاں کے باسیوں نے ہمیشہ اس پر گلاب نچھاور کیے ہیں۔ امیر خسرو بھی دریاے بھوج کے کنارے آئے تھے۔ ملک کافور ان کے ساتھ تھا۔ ان جنگلوں، پہاڑوں، ندیوں اور آبشاروں کے حسن نے ان کا دامن پکڑ لیا تھا۔ انھوں نے دوہے اور گیت لکھے اور یہاں کے لوگوں کو دلچسپ پہیلیاں اور انمل سنا کر چلے گئے۔ پھر جب کشمیر کا راجہ بھرتری ہری راج پاٹ چھوڑ کر جوگ لے کر نکلا تو سارا ہندوستان گھوم پھر کر جب وہ یہاں آیا تو رہنے کے لیے اسے مالوہ ہی پسند آیا اور میرے چرنوں میں اسے بھی علم و عرفان کی دولت مل گئی''۔ (ایضاً،ص:259)

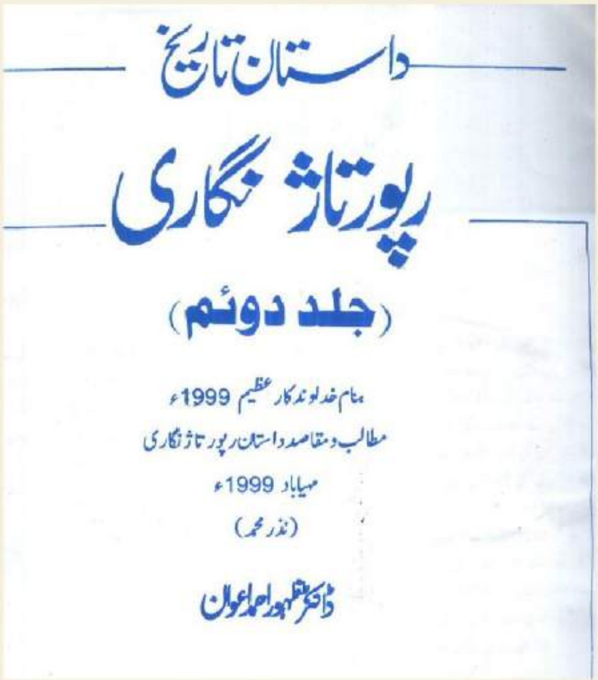

اسی طرح نرتکی اختر جمال کو سانچی میں گیس سے ہوئے عظیم حادثے کا مشاہدہ کراتی ہے، اس سے قومی و ملی، مذہبی و دینی، صنعتی و معاشی اور جانی و مالی تمام تر ہلاکتوں اور تباہیوں کی درد بھرے انداز میں روداد اور داستان سناتی ہے۔ اس طرح بدھ کی داسی نرتکی رپورتاژ نگار اختر جمال کے ساتھ بیانِ واقعہ کی ابتدا سے انتہا تک پورے سفر میں ہمراہ اور ہم رکاب رہتی ہے۔ اختر جمال نے رپورتاژ میں قاری کو سانچی کے مختلف مقامات کے مناظر اور پہاڑوں کی بلندیوں اور خوب صورتیوں وغیرہ کی سیر کرائی، ساتھ ہی انھوں نے متعدد جگہوں کے احوال و کوائف، جغرافیائی حصے و نقشے، قدرتی مناظر اور صنعتی امور وغیرہ کے بارے میں بھی آشنا کرایا ہے۔

رپورتاژ نگاری کے آداب و تقاضے میں کردار نگاری بھی ایک نہایت اہم کڑی ہے، جس کا وجود لازمی ہے۔ یعنی کردار حقیقی ہوں، خیالی یا تصوراتی نہیں۔ رپورتاژ نگار کردار کی شخصیت، اس کی مختلف جہتوں اور اس کے جذبات و احساسات سے ذاتی طور پر واقف ہو۔ رپورتاژ کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر طلعت گل نے لکھا ہے:

> ''رپورتاژ نگار کے لیے شرطِ اول اور لازم ہے کہ وہ جس واقعے یا حادثے کو قلم بند کرے، اس کا وہ چشم دید گواہ ہو۔ سنی سنائی باتوں کو رپورتاژ کے عنوان سے تحریر نہیں کیا جاسکتا''۔

(اردو رپورتاژ۔تحقیق وتنقید:ص:211)

اختر جمال کے رپورتاژ میں جس میں خود رپورتاژ نگار بھی ایک نمایاں کردار کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن ان کے علاوہ دوسرا کردار ایک خیالی اور فرضی ہے، جو رپورتاژ نگاری کے اصول پر قائم نہیں ہے۔ شاید فن رپورتاژ کے اصول وضوابط کے فقدان کے سبب ڈاکٹر طلعت گل نے اپنی تصنیف ''اردو رپورتاژ۔ تحقیق وتنقید'' میں ''بھوپوشیما'' کو شامل نہیں کیا ہے، اور نہ ہی کہیں اس کا کوئی ذکر کیا ہے۔ جب کہ طلعت نے اپنی کتاب میں نہ صرف کئی رپورتاژوں کو شامل کیا، بلکہ ان پر اپنا بے لاگ تبصرہ اور علمی وتحقیقی زاویے سے اپنا خیال اور نقطۂ نظریہ بھی پیش کیا ہے، لیکن بھوپوشیما کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے ''داستان تاریخ۔ رپورتاژ نگاری'' میں اس کو ضرور شامل کیا ہے اور اس پر اپنا تبصرہ اور تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ چناں چہ انھوں نے ''بھوپوشیما'' کی کردار نگاری پر ایک جگہ لکھا ہے:

> ''رپورتاژ میں کردار سچے ہوتے ہیں یا ہونے چاہئیں، مگر یہاں ایک تصوراتی نرتکی کے کردار کو متعارف کرواکے اس کے ذریعے اس حقیقی واقعے کی المناکیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ رپورتاژ چشم دید واقعات کی رپورٹ ہے، مگر یہ واقعہ مصنفہ کے سامنے اس طرح نہیں رونما ہوا، نہ وہ اس کی براہ راست شاہد تھیں''۔

(داستان تاریخ رپورتاژ نگاری:ص:883)

□□□

Mohammad Ansar
D-4/1, First Floor
Shaheen Bagh
New Delhi-110025

غزالہ قمر اعجاز

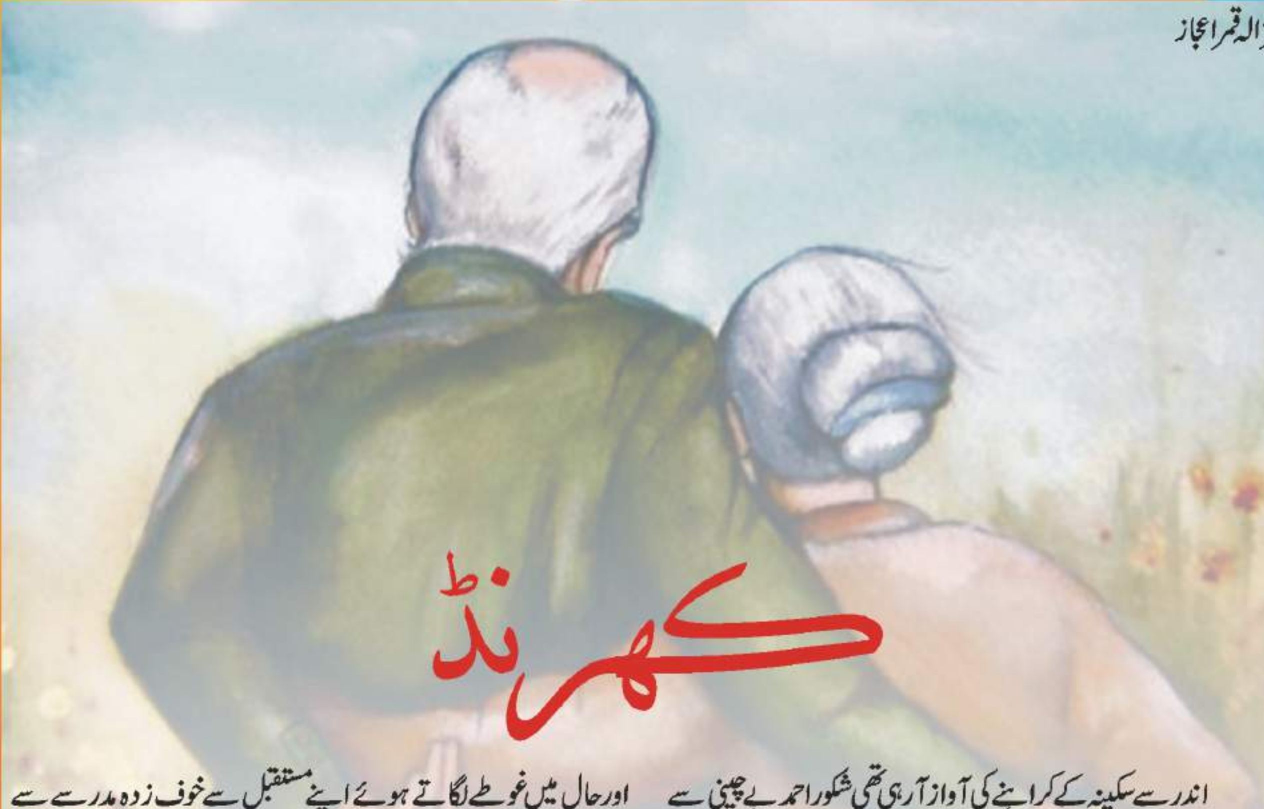

کھرنڈ

اندر سے سکینہ کے کراہنے کی آواز آرہی تھی شکور احمد بے چینی سے دالان میں ٹہل رہے تھے... نظر پشتینی تخت پر آ کر ٹھہر گئی ...کیا کروں... حسرت بھری نگاہ سے چاروں طرف دیکھا...کائی لگی دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹ چکی تھیں۔باہری دروازے کا ایک حصہ گر چکا تھا اور اپنی بربادی کا نوحہ پیش کر رہا تھا وہ تھک کر دالان میں بچھے تخت پر بیٹھتے... گئے... جس پر بیٹھتے ہی ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا اور ان گزرے ہوئے تمام لوگوں کی روحیں اچانک اندر آجاتیں...دیکھتے ہی دیکھتے منظر تبدیل ہوتا... شان و شوکت کا وہی دور... جو ابا کا خاصہ تھا اور ان کے ابا یعنی میرے دادا کی زندگی کا حصہ... میں چیخ چلا کر اپنی موجودگی درج کرانے کی کوشش کرتا... مگر آواز باہر نکلتی ہی نہیں تھی مردانخانے میں عورتوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی... گھر کی ملازمہ چلمن کے اس پار سے سوال جواب کرتی... پان کی گلوریاں اور گرم گرم چائے کا دور چلتا رہتا شعر و شاعری کی محفل سجتی اور واہ واہ کی آواز حویلی میں گونجتی ۔میں نے ہمیشہ دادا کو بیحد ٹھاٹ باٹ کے ساتھ زندگی گزارتے دیکھا تھا ان کی رعب دار آواز حویلی میں دیر تک گردش کرتی رہتی ابا کے دور میں ہندوستان آزاد ہو چکا تھا... انگریز جا چکے تھے... زمینداری ختم ہو چکی تھی... کچھ رشتے دار ہجرت کر گئے تھے اور ابا ان سب کا ماتم کرتے ہوئے اپنا کھویا ہوا بھرم قائم رکھنے کے لیے کھیتوں کو گروی رکھ چکے تھے اور قیمتی سامان اپنے وفادار ملازم کے ہاتھوں فروخت کروا کر وقت گزار رہے تھے۔میں ان حالات کا چشم دید گواہ تھا اور ماضی اور حال میں غوطے لگاتے ہوئے اپنے مستقبل سے خوف زدہ مدرسے سے فارغ ہو چکا تھا آگے کچھ کرنے کے وسائل تھے ہی نہیں بچی کھچی زمین پر کھیتی باڑی میں لگا رہتا شام کو گھر واپس آتا تو ابا حضور میلے سے گاؤ تکیے پر سر رکھے گہری سوچ میں گم نظر آتے مجھے دیکھتے ہی زور سے بیچو کو آواز لگاتے وہ پلک جھپکتے ہی پتہ نہیں کہاں سے برآمد ہو جاتے اور ابا حضور کے سامنے پان کا ڈبہ پیش کرتے... ہاتھ کے اشارے سے ابا ان کو رکنے کے لیے کہتے اور مجھ پر سوالوں کی جھڑی لگا دیتے میں کچھ دیر سر ہلا کر ان کے سوالوں کا جواب دیتا اور پھر اندر آجاتا سکینہ تھیلا لے کر باورچی خانے چلی جاتی اور میں کبوتروں کو دانا کھلانے لگتا آصف چارپائی پر کتاب کھولے سبق دہراتا سات سال کی عمر میں اس نے ناظرہ مکمل کر لیا تھا اور اب اسکول جانے لگا تھا پڑھنے میں ذہین تھا اور ہماری امیدوں کا اکلوتا سہارا... ابا سارا سارا دن اکیلے تخت پر بیٹھے پرانے وقتوں کو یاد کر کے آہیں بھرتے اور نئے زمانے کو کوستے رہتے ان کے کچھ ساتھی گزر چکے تھے اور جو باقی بچے تھے وہ بھی شاید اپنے اپنے گھروں کے کونوں میں بیٹھے یہی کر رہے ہوں گے ابا کے جانے کے بعد دالان سونا ہو گیا اور رہا سہا خاندانی وقار بھی ختم ہو گیا بیچو چاچا بھاری من کے ساتھ گاؤں واپس لوٹ گئے حویلی ویران ہو گئی ۔اجڑے آشیانے میں آصف کا وجود امید کی واحد کرن تھا۔"بابو افسر بن کر گاؤں آئے گا تو یہ تخت اور دالان پھر سے آباد ہو جائے گا"۔

دل کو تسلی ہوتی ۔دسویں کا امتحان اول نمبروں سے پاس کرنے کے

بعد وہ شہر چلا گیا... آنکھوں میں خواب جگمگا اٹھے... نظریں اجڑے گھر کو تکتی رہتیں... گزرا زمانہ سامنے آجاتا آنکھوں کے کنارے گیلے ہوجاتے جنھیں میں بے دردی سے رگڑ دیتا۔ بہت چھوٹا تھا شاید چار پانچ سال کا۔ میں کسی چیز کے لیے رو رہا تھا۔ دادا اندر آرہے تھے انھوں نے تیز آواز میں میرا نام پکارا میں سہم گیا آواز بند ہوگئی مگر سسکیاں گلے میں دبی رہیں۔

''کیسا مرد کا بچہ ہے روتا ہے''

میں رونا بھول گیا اور خوشی سے ہنسنے لگا اور ہنستا ہی رہا... کیونکہ مرد روتے نہیں ہیں دادا کا دور ختم ہوا ابا کا شروع ہوا... حالات بد سے بدتر ہوتے گئے مگر ابا کی آواز کا جادو قائم رہا جس نے بہت سا بھرم بنائے رکھا اور میں ان کے سائے میں جینے کی کوشش کرتا رہا ماضی ختم ہوچکا تھا دادا اور ابا کا وجود کسی داستان کی طرح حویلی میں دفن تھا سکینہ سے میں ان دنوں کے حالات دہراتا... دادا تھے تو ایسا تھا دادا تھے تو ویسا تھا۔ آصف بڑا افسر بن جائے گا تو پھر سب کچھ پہلے جیسا ہوجائے گا وہی رعب داب وہی عیش وعشرت۔ کائی لگی دیواروں پر رنگ وروغن ہوگا... تخت آباد ہوجائے گا۔ باورچی خانے سے آتی لذیذ کھانوں کی خوشبو چاروں طرف پھیل جائے گی اور بیچوں چاچا کی اولاد کھانے کی ٹرے لے کر زنان خانے سے مردان خانے کی طرف دوڑے گی۔ سب کچھ پہلے جیسا ہوجائے گا۔ میں سکینہ کو تسلی دیتا۔ اس کے وظیفے لمبے ہوتے گئے مگر آصف کو افسر بنانے کے وسائل ہمارے پاس نہیں تھے اور جینے کی جدوجہد نے اسے بمبئی پہنچا دیا مگر راتوں رات قسمت بدل دینے والا شہر اس کی قسمت میں لگی کائی کو نہیں دھل سکا اور وہ کسی سیٹھ کی فیکٹری میں اکاؤنٹنٹ کی نوکری کرنے لگا جہاں سے رہنے کھانے کا خرچ بھی مشکل سے نکل پاتا... اسی لیے اس نے اپنے ساتھ کام کرنے والی صبیحہ سے شادی کرلی ابا اکیلی کمائی سے اس بڑے شہر میں گزارا کرنا مشکل ہے اسی مجبوری سے مجھے صبیحہ سے شادی کرنی پڑی۔ سکینہ نے بہت حوصلے کے ساتھ خط سنا اور کام میں لگ گئی مگر سینے میں لگی آگ بجھنے کے بجائے کھانسی کی شکل میں باہر نکلنے لگی اور اب تو اس کا سانس بھی پھولنے لگا تھا۔ حکیم جی نے شہر کے ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ اب بھلا بمبئی سے بڑا بھی کوئی شہر ہے۔ اچھے اچھے ڈاکٹر ہوں گے... وہاں کی دوائی کھاتے ہی وہ پہلے کی طرح تندرست ہوجائے گی... میں نے سکینہ کو بہت سمجھایا مگر وہ راضی نہیں ہوئی۔ پڑوس کے عبدالجبار کا لڑکا ناظم بمبئی جارہا تھا آپ اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ اس کا یہی اصرار رہا۔

''حالت بتا کر ڈاکٹر سے دوائی لے آنا''

مجبوری میں مجھے جانا پڑا۔ آصف کو اطلاع کرنے کا وقت نہیں تھا۔ سکینہ نے بڑے بکسے کا تالا کھول کر ایک ڈبہ نکالا لال کپڑے میں لپٹی زمینداری کی اکلوتی نشانی سکینہ کے ہاتھوں میں جھول رہی تھی۔

''یہ پازیب بہ... بہو کے لیے''

بہولفظ زبان پر آتے آتے اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور جذبات آنکھوں سے رواں ہوگئے میں نے ڈبیا اس کے ہاتھ سے لے کر بیگ میں ڈالی اور جلدی سے باہر آگیا۔

''سکینہ بھی ساتھ رہتی تو اچھا رہتا''۔ راستے بھر یہی خیال آتا رہا

''مرد بھلا ڈرتے ہیں'' کہیں دور سے دادا کی آواز آئی۔

پتہ نہیں آصف کو میرا اس طرح اچانک آنا اچھا لگا یا نہیں اس کا اندازہ میں نہیں لگا سکا۔ ٹوٹی پھوٹی اونچی سیڑھی والے زینے کو پار کرنے کے بعد لمبی راہداری تھی جس میں لائن سے دروازے تھے کچھ کھلے تھے اور کسی میں تالا لگا تھا آصف نے ایک دروازے کا تالا کھولا... ایک چھوٹا سا کمرہ... جہاں ایک کونے میں فرش پر بستر لگا تھا دوسری طرف ایک پرانی الماری رکھی تھی۔ ایک اسٹول پر کئی تھیلے تھے سامنے راستہ تھا جس کے ایک طرف چولھا رکھا تھا آس پاس کچھ ڈبے تھے نیچے بالٹی میں پانی تھا وہاں ایک آدمی مشکل سے کھڑا ہوسکتا تھا آگے ایک دروازہ تھا جو شاید ضروریات کے لیے تھا یہ بمبئی شہر ہے... خوابوں کی نگری... جہاں راتوں رات لوگ امیر بن جاتے ہیں کتنا غلط بتاتے ہیں لوگ زنانہ اور مردانہ حویلی کے دو حصے جہاں اجازت کے بغیر جانا بھی ممنوع تھا اور یہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں... چائے پیتے ہوئے بار بار یہی خیال آرہا تھا... کل ہی لوٹ جانا بہتر ہے۔ بہو کا آنچل بار بار سر سے پھسل رہا تھا اور آصف اشارے سے اسے بتاتا... سوتی کپڑوں میں بغیر کسی سنگھار کے اسے بہو تصور کرنا مشکل تھا... نا چوڑی نا کنگن نا کاجل نا سرخی... چھوٹے چھوٹے بال ربر میں پھنسے تھے اور وہ بہت سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی کھانا کھا کر وہ باہر نکل گئے آصف نے ایک بار بھی سر اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا نا ہی ان کا حال پوچھا تھا تمھاری ماں تم لوگوں کو بہت یاد کرتی ہے ایک بار انھوں نے کہا بھی مگر دونوں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔

''آصف تم تو جانتے ہی ہو مجھے باہر کھلے میں سونا اچھا لگتا ہے. میں وہیں''

''نہیں ابا آپ یہیں لیٹیں.. آج ہم دونوں کی رات کی ڈیوٹی ہے''۔

''رات کی ڈیوٹی...''

مجھے تعجب ہوا... بہو کی بھی مگر میں نے کچھ نہیں پوچھا۔ مجھے نہیں

بولنا ہے پہلا سبق بغیر کسی کے بتائے یہاں آتے ہی میں سیکھ چکا تھا اس لیے خاموش رہا بہو نے پرس اپنے کندھے پر رکھا آصف نے گھڑی دی دونوں چلے گئے۔ پتہ نہیں کون سا کیسا آفس ہے جو رات بھر کھلا رہتا ہے یا ہوسکتا ہے میرے آرام کے خیال سے دونوں کہیں چلے گئے... یہی بات ہوگی مجھے اطمینان ہوا بیگ میں سکینہ کا نسخہ رکھا تھا موت اور زندگی دینے والی ذات اللہ کی ہے اس کی قسمت میں صحت ہوگی تو اللہ انھیں دواؤں سے شفا دے دے گا بڑے شہر کے ڈاکٹر کوئی جادوگر تھوڑی ہیں موت تو یہاں بھی ہوتی ہے... خود سے بات کرتے کرتے پتہ نہیں کب نیند آگئی پھر کسی پہر آنکھ کھلی... پتہ نہیں کیا وقت ہے ان کے پاس گھڑی نہیں تھی... حویلی میں گھنٹے والی گھڑی تھی جس کی آواز چاروں طرف گونجتی... یہاں کی دیوار سونی تھی... کوئی کھڑکی نہیں تھی... چلو وضو ہی کرلیں پانی کی بالٹی خالی تھی... ٹنکی میں پانی نہیں آرہا تھا چھوٹے سے ڈبے میں ضرورت کے لیے پانی تھا بہت سنبھل کر اسے استعمال کرکے وہ واپس بستر پر آگئے اور صبح ہونے کے انتظار میں شاید سو گئے دروازے پر کھٹکا ہوا تو وہ جلدی سے اٹھے دونوں اندر آئے آصف پانی بھرنے لگا اور بہو چائے بنانے لگی۔

''ابا آپ جلدی سے فارغ ہولیں پانی تھوڑی ہی دیر کے لیے آتا ہے''

مسواک کرتے ہوئے وہ کبوتروں کو دانہ ڈالتے... پھر لوٹے بھر پانی سے دیر تک کلی کرتے اور آخر میں پیڑھی پر بیٹھ کر ہاتھ منہ دھوتے۔ ابھی کلی ہی کی تھی کی آصف نے آواز لگائی... وہ جلدی سے باہر نکلے بہو نے چائے اور بسکٹ لاکر رکھا آصف نہانے کے بعد بالٹی بھر رہا تھا چائے پی کر میں باہر چھجے پر آگیا عجیب افراتفری کا عالم تھا کوئی آرہا تھا کوئی جارہا تھا کسی کے ہاتھ میں تھیلا تھا تو کوئی ناشتے دان پکڑے تھا کئی لوگ خالی بالٹی تھامے لڑنے مرنے کو تیار تھے میں نے اپنا ہاتھ ماتھے پر ٹکایا۔ للن خان کی دکان کے سامنے بچھی چارپائی پر بیٹھ کر چائے کے ساتھ اخبار پڑھتے ہوئے اور حالات حاضرہ پر بحث کرتے ہوئے صبح کا زیادہ تر وقت گزرتا تھا آس پڑوس کے تمام خبریں یہاں مل جاتیں کس کے یہاں کون آیا... کون کہاں گیا... بیماری شادی چوری سے لے کر نئے زمانے کے چال چلن اور نوجوانوں کی بے راہ روی پر آہیں بھرتے ہوئے محفل برخواست ہوتی اور سبزی گوشت کا تھیلا لیے سب اپنے اپنے گھر چلے جاتے سکینہ کو صبح کی روداد سناتے ہوئے میں ناشتہ کرتا اور مدرسے کے لیے نکل جاتا سکینہ کا خیال آتے ہی انھوں نے آصف سے جانے کی بات کی ناظم نے بتایا تھا آج رات کی گاڑی سے کامران واپس جارہا ہے تم اس سے بات کرلو تمھاری ماں وہاں اکیلی ہے ورنہ میں... پتہ نہیں آگے میں نے کچھ کہا بھی نہیں... ناشتے کے بعد مجھے آرام کرنے کے لیے کہہ کر دونوں چلے گئے واپس آکر بہو نے کھانا لگایا اور راستے کے لیے کھانا اور پانی کی بوتل رکھی۔ ''یہ اماں کے لیے ہے'' ۔ایک شال اور مٹھائی کا ڈبہ آصف نے بیگ میں ڈالا... یہاں راستے میں جام ہوتا ہے کہیں دیر نا ہوجائے آصف نے کلائی کی طرف دیکھا مگر گھڑی تو وہاں تھی ہی نہیں وہ جلدی سے کمرے سے باہر آگیا ریل کا ڈبہ کھچا کھچ بھرا تھا ایک کے اوپر ایک لوگ گر رہے تھے ہارے ہوئے مایوس چہرے... خوابوں کی دنیا سے دور جارہے تھے۔ یہ تسلی ضرور تھی کی اپنوں کے ساتھ روکھی سوکھی کھا کر خوشی اور غم کو سانجھا کر کے زندگی گزار لیں گے۔ دماغ میں خیالات کا ریلا اُمڈتا رہا سکینہ کے کھانسنے کی آواز باہر تک آرہی تھی میں شاید گیا ہی نہیں... پہلا خیال اسے یہی آیا میں نے اسے مٹھائی کا ڈبہ اور شال دیا جس پر وہ دیر تک ہاتھ پھیرتی رہی بہو کو پازیب پسند آئی... اس نے خوش ہوکر پوچھا اور مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا اسے کھانسی آئی ۔ٹکڑا شاید گلے میں اٹک گیا تھا کھانستے کھانستے وہ بے حال ہوگئی نصیبن بوا اس کی کمر سہلا رہی تھیں اس کے منہ سے مٹھائی رال کی شکل میں باہر نکل رہی تھی ...پھر وہ بے سدھ ہوکر چارپائی پر گر گئی۔ شال اس کے سینے پر رکھی تھی جس کو خریدنے کے لیے آصف نے اپنی گھڑی بیچ دی تھی ۔ میں باہر آگیا ...میرے لیے کچھ بھی ضبط کرنا مشکل تھا۔ دیر سے رکے آنسوں میری آنکھوں سے بھر بھرا کر نکل پڑے دادا کو مرد کا رونا پسند نہیں تھا ابا نے اس روایت کو آخر وقت تک نبھایا... مگر ابا روایت نبھانے کے لیے رتبے اور شان کی ضررت ہوتی ہے مگر میرے پاس باپ دادا کے نام کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اور آصف... اس کے پاس تو وہ بھی نہیں ہے ...یہی وجہ ہے کہ اس کا سر جھکا رہا... میرے آنسوں نکل رہے ہیں ابا میں رو رہا ہوں... مرد بھی روتا ہے ...تب جب اس کے جذبات اس کے الفاظ کی طرح اندر ہی اندر گھٹ جاتے ہیں ...وہ بھی کمزور ہے... اندھیرے سے ڈرتا ہے.... دل سرد ہوجائے تو ہاتھ کپکپانے لگتے ہیں اور آنسوں چیخ بن کر باہر نکل آتے ہیں۔ میں نے بیگ سے پازیب نکالی اور پوری قوت سے دیوار کے اس پار پھینک دی--

□□□

Ghazala Qamar Ejaz
Flat No.2533, Tower E, Avenue 12
Gaur city 2, Greater Noida(west)
G.B.Nagar-201009 (U.P)

کہانیاں

شبیہ زہرا حسینی

پیاسا دریا

"کہاں جارہے ہیں آپ؟" سارہ نے جاوید سے پوچھا۔

"لائبریری جارہا ہوں" فائلوں کو سمیٹتے ہوئے جاوید نے جواب دیا۔

"آج تو اتوار ہے، روز تو ڈپارٹمنٹ جاتے ہیں" اس کی آواز میں شکوہ تھا۔

"ڈپارٹمنٹ روز جاتا ہوں کیونکہ یونیورسٹی کا نوکر ہوں، لائبریری اپنے کام سے جارہا ہوں، بہت سے کام پڑے ہوئے ہیں جنھیں مکمل کرنا ہے۔"

"کتنی دیر میں واپسی ہوگی؟ سارہ نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"اب جب بھی کام ختم ہوجائے؟" کہتا ہوا جاوید چلا گیا۔

سارہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دل اندر سے مسل ڈالا ہو۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، کیونکہ شادی کے دوسرے دن سے ہی اس نے اپنے شوہر کا یہی رویہ دیکھا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ اپنے دل کو یہ سوچ کر سمجھا لیتی کہ اس کا شوہر ملک کا نامور ادیب ہے، اردو ادب میں اس نے ایک زبردست مقام پیدا کرلیا ہے، اور کم عمری کے باوجود ہندوستان کے مشہور اور مایہ ناز نقاد میں شمار کیا جانے لگا ہے...... اس لیے فطری طور پر سنجیدہ طبیعت کا مالک ہے۔ جاوید نے دنیا کی ہر وہ چیز اس کو مہیا کردی تھی جو ایک عورت چاہتی ہے، خوبصورت گھر تھا، آسائش کی ہر چیز اس کے گھر میں موجود تھی، روپیہ پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی، کسی طرح کی کوئی روک ٹوک نہیں تھی، ہر طرح کی آزادی اسے میسر تھی، لیکن...... پھر بھی ایک خلش تھی جو اس کے دل کو اندر ہی اندر سے زخمی کیے دے رہی تھی، ایک انوکھی سی کمی تھی جو مسلسل اس کو محرومیت اور اکیلے پن کا احساس دلاتی رہتی۔

سارہ اپنے کالج کی بیحد چنچل اور ہنس مکھ لڑکیوں میں سے ایک تھی، ایک مہکتا ہوا گلاب تھی، بات کرتی تھی تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ جس کی ایک دفعہ اس پر نظر پڑتی تھی وہ دوبارہ مڑ کر ضرور دیکھتا تھا...... اس کا حسن ہی کچھ ایسا تھا...... نسیم صبح کی طرح تازہ۔ دم کردینے والا...... ماں باپ نے اسی لیے اس کا نام سارہ رکھا تھا۔ جاوید کی بہن نے اس کو ایک میلاد میں دیکھتے ہی اپنے اکلوتے بھائی کے لیے پسند کرلیا تھا...... لڑکا بھی ہر طرح سے ٹھیک تھا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لیکچرر تھا...... اس کا اردو ادب میں بڑا نام بھی تھا، اخبار اور ٹیلی وژن میں بھی برابر تذکرہ رہتا تھا...... اگلے ماہ شادی ہونا بھی طئے پا گئی۔

"ارے سارہ جاوید بھائی تو گھونگٹ اٹھاتے ہی ان جھیل نما آنکھوں میں ڈوب جائیں گے...... اور......"

"ارے...... جب جاوید بھائی اس کا گھونگٹ اٹھائیں گے اور یہ اپنی یہ حسین پلکیں اوپر اٹھائے گی تو...... جاوید بھائی کہہ اٹھیں گے

نہ اور کھول ابھی نیم باز آنکھوں کو
ترے نثار یہ جادو ابھی جگائے جا

اس سے پہلے کہ خلود اپنا جملہ پورا کرتی، ریحانہ بیچ میں بول پڑی۔

"اچھا بس رہنے دو تم لوگ" سارہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔

"سچ سارہ ہم کالج کی سب لڑکیاں تمھاری آنکھوں پر مرتی ہیں،

یادنہیں تم کو...... ہمارے کالج کے فیرویل (Farewell) پارٹی میں تمھاری آنکھوں پر ہی تو complement ملا تھا۔ کیا تھا...... بھلا وہ شعر......؟

فیض احمد فیض کا تھا...... ہاں...... یاد آ گیا......

تری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

خلود نے مسکرا کے شعر پڑھا۔

تنہائی میں ماضی کی یہی باتیں اور دوستوں کی سرگوشیاں اس کے ذہن میں اپنا جال بننا شروع کر دیتی تھی۔

''بکواس کرتی تھیں سب...... جاوید نے تو مجھے کبھی ایسا کچھ احساس نہیں دلایا۔ ''تقدیر نگوں ہو جائے'' وہ بڑبڑاتی اور ذہن کو ایک جھٹکا دے کر اپنے کو کسی گھریلو کام میں مصروف کر لیتی۔

جاوید کا زیادہ تر وقت یونیورسٹی میں ہی گذرتا، وہاں سے واپس آتا تو جلدی جلدی کھانا کھا کر سو رہتا، شام میں شاگردوں ، دوستوں اور مداحوں کا تانتا بندھ جاتا...... رات کا بڑا وقت اسٹڈی روم میں گذر جاتا۔ سارہ تنہا بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہتی......اور اکثر اس کا انتظار کرتے کرتے سو جاتی......اور جاوید اپنی شریک حیات کے نازک جذبات سے قطعی بے خبر، فکر و تخیل کے موتی پروتا رہتا...... اور پھر کافی رات گئے خاموشی سے دبے پاؤں آ کر سو رہتا۔

شروع شروع میں سارہ کچھ بھی نہ بول سکی، اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے اس کے اس رویہ کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار دبے لفظوں میں کرنا شروع کر دیا۔

آپ تو بس ہر وقت پڑھتے رہتے ہیں یا لکھتے رہتے ہیں'' ایک دن اس نے جاوید سے کہہ ہی دیا۔

''اور کیا کروں پھر؟ بھئی یہ میرا کام ہے'' جاوید کی تیوریاں چڑھ گئی۔

''ٹھیک ہے کام کریں آپ، لیکن کبھی میرے پاس بھی تو بیٹھا کیجیے''

''یونیورسٹی سے آ کر گھر پر ہی رہتا ہوں'' جاوید کی آواز میں تلخی نمایاں تھی۔

''لیکن مجھے اس سے کیا؟ آپ رہتے تو اپنی کتابوں کے ساتھ ہیں'' سارہ نے روہانسی ہو کر جواب دیا۔

''سارہ......ایک ادیب کی یہی زندگی ہوتی ہے'' جاوید نے صفائی پیش کی۔

''لیکن جاوید ایک ادیب کی اگر ایسی ہی زندگی ہوتی ہے تو میرے خیال میں ادیب کو شادی نہیں کرنی چاہیے، اس کا دل بہلانے کے لیے اس کی کتابیں اور اس کا فن ہی کافی ہے'' سارہ کے لہجے میں طنز تھا۔

''یہ حقیقت ہے کہ کتابیں مجھے بہت عزیز ہیں، آئندہ میری کتابوں اور میرے کریر کے بیچ میں آنے کی کوشش نہ کرنا...... ہر ایک کا اپنا اپنا مقام ہوتا ہے''

''تو اپنی زندگی میں آپنے مجھے کون سا مقام دیا ہے؟ مجھے آپ کی کتابیں زہر لگنے لگی ہیں، مجھے بڑی حسرت ہے کہ کچھ دیر آپ میرے پاس بیٹھیں اور میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔''

''کھانا تمھارے ساتھ کھاتا ہوں، چائے تمھارے ساتھ پیتا ہوں......اب آخر تم چاہتی کیا ہو'' جاوید کے صبر کا پیالہ لبریز ہونے لگا۔

''میں چاہتی ہوں...... آپ میرے ساتھ باہر گھومنے چلا کیجیے، کبھی وہ لمحات بھی ہماری زندگی میں آئیں جب صرف آپ اور میں ہوں''۔

''اور میں تمھاری زلفوں میں پھول پروتا رہوں، فلمی گیت گنگناؤں۔ سارہ...... یہ سب فلمی باتیں ہیں۔''

جاوید نے اس کے بولنے سے پہلے ہی جملہ پورا کر دیا۔

''سارہ...... تمھیں اندازہ نہیں ہے، میرا وقت بہت قیمتی ہے، میں زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں......'' جاوید نے کچھ ٹھہر کر کہا۔

سارہ کو محسوس ہوا جیسے جاوید نے اس کو پوری شدت سے جھنجوڑ ڈالا ہو۔ اس دن کے بعد سے اس نے جاوید سے کسی قسم کا مطالبہ نہیں کیا۔ نہ شکایت کی نہ غصہ کیا...... زندگی کے دن گذرتے رہے...... جاوید کئی کتابوں کے مصنف بن گئے...... لیکن سارہ کے اندر کی عورت کڑھتی رہی۔ ایک پیاس تھی جو وہ محسوس تو کر سکتی تھی، اس کو کوئی نام نہ دے پائی۔ تنہائی کے احساس کو پُر کرنے کے لیے اس نے اپنے کو ٹی وی کا عادی بنا لیا۔ اس رات ٹی وی پر بہت رومانٹک فلم آ رہی تھی...... فلم کے اکثر سین کچھ ایسے جذبات انگیز تھے...... کہ کچھ عجیب قسم کے ارمان اس کے دل میں بھی ابھرنے لگے۔ وہ مسہری پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر جب اسے دم سا گھٹتا محسوس ہونے لگا تو وہ گھبرا کر کمرے سے نکل آئی۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے غیر ارادی طور پر جاوید کے اسٹڈی روم کی طرف اس کے قدم اٹھ گئے۔ جاوید کے کمرے کی روشنی کھڑکیوں سے چھن کر باہر آ رہی تھی۔ سارہ نے آہستہ سے جھانک کر دیکھا، جاوید کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ آج وہ جاوید سے کھل کر بات کرے گی، اس کو اپنا دل کھول کر دکھا

دے گی......ایک جوان دل کے جذبات کیا ہوتے ہیں......اس کو سمجھا دے گی...... اچانک جاوید کمرے سے باہر نکلا اور سارہ کو دیکھ کر قدرے حیرت سے بولا ”اتنی رات گئے، اس ٹھنڈک میں یہاں کہاں......؟“

سارہ کا دل چاہا کہ وہ اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دے لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اندرونی طوفان کو بڑی خاموشی سے دبا دیا۔ عورت ایک ایسی کھلی ہوئی کتاب ہے جس کے ورق کھلے ہونے کے باوجود ان کا پڑھنا بہت مشکل کام ہے۔

”میں آپ کو ہی دیکھنے آئی تھی“

کیوں؟ جاوید نے چونک کر پوچھا۔

”جاوید ...... کیا آج آپ سوئیں گے نہیں...... رات کا ایک بجا ہے“

”ہاں......سونے ہی تو آ رہا ہوں، آج بہت زیادہ تھک گیا ہوں“ جاوید نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

ایک دن اس نے بڑے پیار سے چنے کا حلوہ بنایا تھا۔ اس نے ایک بار اپنی ساس کو کہتے سنا تھا کہ جاوید کو چنے کا حلوہ بہت پسند ہے۔ سارہ نے بڑی محنت سے حلوہ بنایا اور شام کے ناشتے پر اس کے سامنے رکھا۔ اسے یقین تھا کہ جاوید اس کے بنائے ہوئے حلوے کی ضرور تعریف کریں گے اور شاید فرطِ محبت سے مغلوب ہو کر اس کا ہاتھ بھی چوم لیں۔ اس تصور سے اس کی تکان دور ہو گئی تھی۔

”یہ حلوہ میں نے خود بنایا ہے“ جاوید کو حلوے کے بڑے بڑے لقمے حلق سے نیچے اتارتے دیکھ کر اس نے بچوں کی طرح کہا۔

”کیا بوا آج نہیں آئیں؟“

”بوا تو آئیں تھیں، لیکن...... چنے کا حلوہ آپ کو پسند ہے نا...... میں نے سوچا آپ کے لیے خود ہی بناؤں“ سارہ نے اس کو پھر ٹٹولا۔

”ہوں......اماں بھی اکثر پکایا کرتی تھیں میرے لیے“

”آپ کو شاید پسند نہیں آیا...... میرے ہاتھ کا بنا حلوہ“ سارہ نے ایک نیا پہلو نکالا۔ اس نے سوچا......شاید اب جاوید اس کی محنت کا صلہ ایک پیار بھری تعریف سے دے دے۔

”نہیں ایسی بات تو نہیں“ جاوید نے بہت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ پھر سارہ خاموش ہو گئی......اور اس وقت اسے محسوس ہوا کہ حلوہ بھونتے بھونتے اس کا بازو درد سے شل ہو گیا تھا۔

ایک روز سارہ کو میلاد میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ ایک دفعہ جاوید نے باتوں کے دوران کہا تھا کہ اسے ہلکا نیلا رنگ بہت پسند ہے......اس لیے سارہ نے بڑی نفاست کے ساتھ ہلکے نیلے رنگ کی ساڑی پہنی، ہلکے نیلے رنگ کا موتیوں کا نازک سا سیٹ پہنا۔ میلاد میں جانے کا وقت آ رہا تھا......اور وہ جاوید کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی...... ہر آہٹ پر کان تھا......اسے یقین تھا کہ ہلکے نیلے رنگ کی ساری میں ملبوس دیکھ کر وہ ضرور اس کی تعریف کریں گے، عجب نہیں جذبِ محبت سے بے قرار ہو کر وہ مجھے چوم بھی لیں......خوشی سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور چہرے پر گلاب کھل اٹھے۔ اچانک اسے کار کے ہارن کی آواز سنائی دی...... وہ لپک کر دروازہ کی طرف بڑھی...... جاوید کے ہاتھوں میں بہت سی کتابیں تھیں۔

”لایئے میں پکڑ لوں آپ کی کچھ کتابیں“ کہتی ہوئی سارہ اس کی طرف بڑھی۔

”کیا کہیں جانے کا پروگرام ہے؟“

سارہ کو محسوس ہوا جیسے ابھی وہ کہے گا......”ڈارلنگ آج تو تم غضب ڈھا رہی ہو......تمہاری جھیل نما آنکھوں میں ڈوبنے کو جی چاہتا ہے“............اور وہ میلاد جانا ہی ترک کر دے گی۔ لیکن جب وہ سوال کر کے رک گیا تو اس نے جواب دیا......آواز میں بڑی مایوسی تھی۔

”جی......میلاد شریف کی محفل میں جا رہی ہوں۔ کیا مجھ سے کوئی کام ہے آپ کو؟“

”نہیں سارہ......تم جاؤ...... آج مجھے بھی بہت کام کرنا ہے“

کہتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔

چند ثانیئے کے لیے وہ بت بنی وہیں کھڑی رہی...... پھر بھاری قدموں سے گیرج کی طرف مڑ گئی۔ اس قسم کے واقعات اس کی زندگی کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی میں وہ ایک زبردست خلاء محسوس کرتی تھی...... ہر پل...... ہر لحظہ وہ اپنے شوہر کے منہ سے چند محبت بھرے الفاظ سننے کے لیے منتظر رہتی......لیکن جاوید اس کے ان تمام جذبات سے بے خبر اپنی تصنیف و تالیف میں منہمک رہتا۔

دن گذرتے رہے......سارہ ایک بیٹے کی ماں بھی بن گئی۔ اب اس کا زیادہ تر وقت علی کی پرورش اور تربیت میں صرف ہونے لگا۔

سارہ کی محنت رائیگاں نہیں گئی......اور کافی کم عمری میں ہی علی نے بی ٹیک (B.Tech) پاس کر لیا اور جلد ہی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں نوکری بھی مل گئی۔

”اب ہمیں علی کی شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے“ ایک دن

سارہ نے موقع دیکھ کر جاوید سے کہا۔
''کیا کوئی لڑکی آپ کی نظر میں ہے؟''
''میں تو اپنی دوست خلود کی بیٹی کو بہو بنانا چاہتی ہوں، اب آپ کی مرضی معلوم کرنا چاہتی ہوں''
''مرضی علی کی معلوم کرو...... کیا تم نے اس سے پوچھا؟'' جاوید کی آنکھوں میں بھی خوشی کی چمک نمایاں تھی۔
''میں نے سوچا پہلے آپ سے پوچھ لوں تب اس سے تذکرہ کروں'' سارہ نے وضاحت کی۔
''ارے تم ماں بیٹے کی پسند میری پسند ہے'' جاوید نے مسکرا کر جواب دیا۔ اس دن جیسے ہی علی گڑگاؤں سے آیا...... سارہ نے اس سے شادی کی بات چھیڑ دی۔
''علی بیٹے کوئی لڑکی تو تمھاری نظر میں نہیں ہے، میرا مطلب ہے پسند تو نہیں ہے''۔
''ہاں ایک لڑکی بہت پسند ہے'' اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔
''کون؟'' سارہ چونک سی گئی۔
''میری ممی'' اس نے اپنی ماں کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔
''ارے پگلے...... مجھے ڈرا دیا تھا...... بات سیریس ہے...... غور سے سنو...... میں نے ثنا کو اپنی بہو بنانے کا ارادہ کیا ہے، تمھیں تو کوئی اعتراض نہیں۔''
''اگر میری ممی کو ثنا پسند ہے تو مجھے بھی پسند ہے''
''تم ایک بار اس کو دیکھ تو لو''
''مما...... لڑکی بس آپ جیسی ہونی چاہیے، مجھے یہ گارنٹی دے دیجیے، مجھے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے'' علی نے بڑے لاڈ سے کہا۔
''اچھا تمھاری مما میں کیا خاص بات ہے؟'' سارہ نے مسکرا کر پوچھا۔
Master Piece ہیں میری ممی...... ہر خوبی سے بھرپور...... اور اتنی خوبصورت'' علی کہہ رہا تھا اور سارہ سوچنے لگی......
''کاش جاوید نے بھی مجھ سے کبھی ایسا کچھ کہا ہوتا......''
علی کی شادی کو چند روز ہی باقی رہ گئے تھے۔ سارہ نے شادی کی تیاری میں خون پسینہ ایک کر دیا تھا...... بڑے ارمان کے ساتھ پھر ایک دن چاند سی بہو بیاہ کر گھر بھی لے آئی۔ سرخ غرارے میں ثنا بہت ہی پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ اپنی پری پیکر بہو کو دیکھ کر سارہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ مہمانوں اور رشتے داروں کے تعریفی جملے سارہ کو مزید سرشار کر رہے تھے۔
''سارہ...... بہو تم بلاشبہ خوب چن کر لائی ہو''
''بہو تو اتنی ہی خوبصورت آنی چاہیے تھی...... خود سارہ اتنی خوبصورت ہے'' ایک دوسری دوست نے سارہ کے انتخاب کو سراہتے ہوئے کہا۔
اسی طرح کی خوش گپیوں میں وقت کے گذرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا...... رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ ساری رسومات کی ادائیگی کے بعد دلہن کو علی کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ سارہ شادی کے ہنگاموں میں اس قدر انہماک کے ساتھ مشغول تھی کہ اس کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ تکان کی وجہ سے اسے کافی تیز بخار ہو گیا تھا۔
دلہن کو اس کے کمرے میں پہنچانے کے بعد اچانک اس کی ہمت نے جواب دے دیا...... اور اس کے قدم بری طرح ڈگمگانے لگے...... تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہ اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی اور مسہری پر گر پڑی۔
جاوید گھبرا کر کھڑا ہو گیا...... سارہ کی آنکھیں بند تھیں۔ جاوید نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا...... پیشانی بہت گرم تھی لیکن پسینے سے شرابور تھی۔
''سارہ تمھیں کیا ہو رہا ہے...... میری جان...... اپنے کو سنبھالو...... میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا......'' جاوید بے اختیار اس کی پیشانی کو چومنے لگا۔
اپنی بھیگی ہوئی پیشانی پر جاوید کے گرم گرم لبوں کا لمس محسوس کرتے ہوئے...... دھیمے دھیمے سارہ کی آنکھیں کھلنے لگیں اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بڑی حیرت سے جاوید کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ سارہ کو ہوش میں آتا دیکھ کر جاوید نے فرط مسرت سے اس کو اپنی باہوں کے حصار میں لیتے ہوئے کہا۔
''تمھیں کیا ہو گیا تھا سارہ؟ میں تو ڈر گیا تھا...... تم کو کافی تیز بخار ہے...... ''سارہ...... تم اپنا خیال بالکل نہیں رکھتیں...... معلوم ہے تمھیں...... تم کس قدر عزیز ہو مجھے''
جاوید بڑے پُر وقار اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں سارہ سے کہہ رہا تھا...... اور سارہ کو یوں محسوس ہوا جیسے ساری دنیا اس کے قدموں تلے آ گئی ہو۔ OOO

Shabih Zahra Husain
C/o. Mahtab Alam Nadvi
Iqra Colony
Aligarh-202001 (U.P)

فرحانہ نازنین

خامشی

یہ زمین خامشی میں
ڈوبی ہوئی
آسمان کو تک رہی ہے
اور آسمان اس سے بے خبر
خواب بن رہا ہے کوئی
ساحلوں سے ٹکراتی
سمندر کی لہروں کا شور
فضا میں پھیل رہا ہے
ہر طرف ایک سکوت ہے طاری
یوں لگتا ہے
گردشِ ایام رک گئی ہے کہیں
پرندے بھی چپ چاپ
اپنے اپنے گھونسلوں میں
بیٹھے ہیں
اک خامشی
شور وغل سے پرے
اس زمین پہ چھائی ہے
یوں لگتا ہے
انسانوں کی چیرہ دستیوں سے
گھبرائی ہوئی یہ زمین
خود کو سمیٹ رہی ہے
اور
سنورنے کی چاہت
دل میں چھپائے ہوئے
آسمان کی بانہوں میں
سمٹ رہی ہے

لفظ قیدی نہیں ہوتے

لفظ معنی کے دائرے میں
سرگرداں
سدا آزاد رہتے ہیں
لبادہ قوس وقزح
کا زیب تن کیے
صحرا کی وادیوں میں
بے خطر قیام کرتے ہیں
تم انھیں
تواریخ، سوانح، اور احادیث
کے دائرے میں
تلاش کرتے ہو
مذہب کا پیرہن پہنا کر
نہ نظر آنے والی زنجیروں میں
جکڑنا چاہتے ہو
مگر
یہ لفظ ہیں،
یہ کبھی سرحدوں، مذہبوں،
اور ذاتیات کے پھندوں میں
نہیں بندھتے،
لفظ قیدی نہیں ہوتے،
ہوا کے سنگ پھرتے ہیں،
سدا آزاد رہتے ہیں۔

Farhana Nazneen
Shahadat Market
Kachhari Road
Begusarai-851101 (Bihar)

باورچی خانہ

لذیذ پکوان

ویجیٹیبل ڈمپلنگز

آلو چار عدد، بیسن دو کپ، پھول گوبھی ایک عدد، انڈا ایک عدد ہری مرچ چار عدد (کٹی ہوئی)، ہری مرچ چھ عدد (بیج نکال لیں) پالک کے پتے چھ سے آٹھ عدد پودینہ آدھی گٹھی (کٹا ہوا) ہرا دھنیا آدھی گٹھی (کٹا ہوا)، بیکنگ پاؤڈر ایک چائے کا چمچ، سرسوں کے بیج ایک چائے کا چمچ، لال مرچ پاؤڈر ایک کھانے کا چمچ، دہی ایک کھانے کا چمچ، تیل حسب ضرورت، نمک حسب ذائقہ

ہری مرچ بھرنے کے لیے

سونف ایک چائے کا چمچ، سرسوں کے بیج ایک کھانے کا چمچ، سفید زیرہ ایک کھانے کا چمچ، دھنیا ایک کھانے کا چمچ، املی کا جوس حسب ضرورت

1. آلوؤں کو ابال کر سلائس کاٹ لیں۔
2. ایک پیالے میں بیسن، انڈا، لال مرچ پاؤڈر، سرسوں کے بیج، کٹی ہری مرچ، پودینہ، دھنیا، نمک، بیکنگ پاؤڈر اور دہی ڈال دیں۔
3. پھر تھوڑا پانی ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں یہاں تک کہ مکسچر گاڑھا ہوجائے۔
4. پھر آلو کے سلائس، گوبھی اور پالک کے پتوں کو اس مکسچر میں ڈبو کر ڈیپ فرائی کرلیں۔
5. ہری مرچ بھرنے کے لیے: پین میں سونف، سرسوں کے بیج، سفید زیرہ اور دھنیے کو ایک ساتھ بھون کر پیس لیں۔
6. اور املی کے جوس کے ساتھ اچھی طرح مکس کرلیں۔
7. ہری مرچوں کو اس مکسچر سے بھرلیں اور بیسن والے مکسچر میں ڈبو کر ڈیپ فرائی کرلیں۔
8. فرائی ویجیٹیبل ڈمپلنگز گرم گرم سرو کریں۔

چٹ پٹا شلجم چکن

چکن ایک عدد (سولہ ٹکڑے)،شلجم آدھا کلو،ادرک لہسن کا پیسٹ ایک کھانے کا چمچ،نمک حسب ذائقہ،تیل ایک پیالی،لال مرچ ایک کھانے کا چمچ (کُٹی ہوئی)ہلدی ایک چائے کا چمچ،دہی آدھی پیالی،چینی ایک چائے کا چمچ،کالی مرچ ایک چائے کا چمچ (کُٹی ہوئی)،لیموں چار عدد ،ہری مرچ آٹھ عدد (باریک کٹی ہوئی)،ہرا دھنیا ایک گٹھی (باریک کٹا ہوا) گرم مصالحہ ایک چائے کا چمچ (پسا ہوا)

1. پہلے شلجم کو چھیل کر چھوٹے کیوبز میں کاٹ لیں۔
2. چکن کے ٹکڑوں کو اچھی طرح دھو کر ایک کڑاہی میں ڈال دیں۔
3. ساتھ ہی ادرک لہسن کا پیسٹ اور نمک ڈال کر پانی خشک کرلیں۔
4. اب اس میں تیل، کُٹی لال مرچ، ہلدی اور دہی ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔
5. پھر شلجم کے کٹے کیوبز الگ پین میں تَل کر چکن میں ڈال دیں۔
6. اس کے بعد چینی، کالی مرچ، لیموں کا رس، کٹی ہری مرچ، ہرا دھنیا اور پسا گرم مصالحہ شامل کر کے دم پر رکھ دیں۔
7. جب شلجم کا پانی خشک ہونے لگے تو انھیں ہلکا سا بھون کر اُتار لیں۔
8. مزے دار چٹ پٹا شلجم چکن تیار ہے۔

مکس سبزی ہانڈی

آلو چار عدد کیوبز)،مٹر ایک پیالی (چھلے ہوئے)، گاجر دو عدد (گول باریک کٹی ہوئی)سیم کی پھلی دس عدد (تین تین ٹکڑے کی ہوئی)لال مرچ چھ عدد (ثابت)ہلدی ایک چائے کا چمچ،نمک حسب ذائقہ،میتھی ساگ چھ عدد،سویا دو گٹھی (باریک کٹا ہوا)،سوکھی کھٹائی چار عدد، ہری مرچ چھ عدد،میتھی دانہ چند عدد،سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ،تیل ایک پیالی

1. پہلے آلو چھیل کر کیوبز بنالیں۔
2. اب کڑاہی میں تیل گرم کر کے آلو کے کیوبز گولڈن براؤن کریں۔
3. پھر ہانڈی میں تیل ڈال کر چند میتھی دانے اور سفید زیرہ ڈالیں۔
4. جب خوشبو آنے لگے تو چھلے ہوئے مٹر، گاجر،سیم کی پھلی، ثابت لال مرچ، ہلدی، نمک، میتھی ساگ اور سویا ڈال کر ڈھک دیں۔
5. جب سبزیوں کا پانی خشک ہونے لگے تو اُن میں چار عدد سوکھی کھٹائی، ہری مرچ اور آلو ڈال کر پانچ منٹ دَم پر رکھ دیں۔
6. مزے دار سبزی ہانڈی گرم گرم چپاتی کے ساتھ سرو کریں۔

(بحوالہ: www.khanapakana.com)

□□□

ڈاکٹر بشریٰ اشرف

پی سی او ڈی اور ہومیو پیتھی

تعارف وتمہید:

'پی سی او ڈی (PCOD(Polycystic Ovary Diseases یا پھر (PCOS(Polycystic Ovary Syndrome ایک ایسا بگاڑ، بیماری یا مرض ہے جو سب سے پہلے اٹلی کے ڈاکٹر Antonio Vallisner نے 1721 عیسوی میں دریافت کیا پھر 1844 میں اس پر مزید تحقیقات ہوئی اور 1935 عیسوی میں اسے یہ نام دیا گیا اس بیماری یا مرض کو پہلے Stein-Leventhal Syndrome کہتے تھے 2 سے 40% تک 12 سے 45 سال کی خواتین اس مرض میں مبتلا ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف جگہوں پر اس کا شرحِ تناسب مختلف ہے۔ جو امراض بہت سرعت کے ساتھ پھیل رہے ہیں ان میں PCOD بھی شامل ہے سابقہ دو دہائیوں میں اس مرض نے پوری دنیا میں کافی ترقی کی جن میں ہندوستان اور خاص طور پر کشمیر بھی شامل ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ 18 سے 20% تک بچوں کی پیدائش کے قابل خواتین بھی اس مرض میں مبتلا دیکھی جاسکتی ہیں۔ کچھ ماہرین امراض نسواں کا خیال ہے کہ وہ لڑکیاں بھی اس مرض میں مبتلا ہیں جو ابھی سنِ بلوغت کو بھی نہیں پہنچی ہوتی ہیں جو بہت ہی قابلِ تشویش اور فکرمندی کی بات ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے ابھی تک اس کی کوئی خاص وجہ کا بھی پتہ نہیں چلا ہے اور نہ ہی اصل حقائق سامنے آئے ہیں۔

عام بات یہ ہے کہ بیضہ دانی کی دیواروں پر چپکی یا لٹکی ہوئی Cysts (پانی یا کسی دوسرے میٹریل و مواد سے بھری ہوئی آبلہ نما چھوٹی چھوٹی تھیلیاں) ہوتی ہیں جو دراصل وہ بیضے یا انڈے ہوتے ہیں جو ابھی پکے یا اپنی مدتِ تکمیل کو نہیں پہنچے ہوتے ہیں تاکہ وہ کسی سہارے کے بغیر متحرک ہوکر وہاں سے خارج ہوکر اپنی اصلی منزل کی طرف جاسکیں۔

جسم میں اس طرح ہارمونز کے نارمل لیول میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ Hormone ٹیسٹ میں زیادہ تر FSH,LH, Androgen, Testosterone,Estrogen, کیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ Serum Prolactin وغیرہ ٹیسٹ بھی کرائے جاتے ہیں۔

مارچ 2018 میں ملک میں ہونے والی ایک ریسرچ سے پتہ چلا ہے کہ PCOD میں مبتلا خواتین کو اس بات کا بہت احتمال رہتا ہے کہ وہ Liver Diseases میں مبتلا ہوجائیں ان کے جسم میں مردانہ ہارمونز کی وافر مقدار میں موجودگی سے موٹاپے کے احتمال کے ساتھ ساتھ Non-alcoholic fatty liver بگاڑ کا بھی احتمال رہتا ہے۔ اس لیے انھیں اپنے جگر کی طرف خاص توجہ دینی چاہیے خاص طور پر اگر وہ حاملہ ہوں۔

وجوہات واسباب:۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے کہ ابھی تک اس بیماری کے اصل وجوہات واسباب کے بارے میں پتہ نہیں چلا ہے البتہ تحقیق سے کچھ باتیں اس ضمن میں ثابت ہوئی ہیں کہ اس مرض کی پیدائش میں کچھ عوامل ذمہ دار ہوسکتے ہیں مثلاً خاندانی یا وراثتی وجوہات وموجودگی، رہن سہن اور کھانے

پینے کے عادات وغیرہ،موجودہ دور کے طرز زندگی یا Life Style کو اس سلسلے میں کافی اہمیت دی گئی ہے جو دماغی تناؤ اور Stress سے بھرا ہوا ہے،کھانے پینے کے غلط عادات، آرام طلبی، نیند کی کمی، موٹاپا، مضر صحت ادویات کا استعمال وغیرہ۔

وراثتی منتقلی کے بارے میں یہ مثال دی جارہی ہے کہ اگر ایک خاتون کی وراثت میں PCOD ہے تو اس کی آنے والی نسل میں اس بیماری کا 50% خطرہ موجود ہے اور پھر یہ اسی طرح نسل در نسل وراثت میں منتقل ہوتا رہے گا۔

وراثتی منتقلی، فشار الدم (Blood Pressure) کی زیادتی، انسولین Resistance جیسے وجوہات کو بھی PCOD کے اسباب میں گنا جاتا ہے لیکن یہاں یہ بات بھی تحقیق طلب ہے کہ خون میں شوگر کی مقدار کا توازن خون میں ہارمونز کی کمی بیشی سے کیسے انسولین کی مقدار پر اثر انداز ہوتا ہے۔

علامات:۔

ماہواری کی بے قاعدگیاں، ماہواری زیادہ ہو، لیکن اکثر مریضوں میں کم آئے، مہینوں کے وقفے سے آئے اور درد کے ساتھ آئے، PCOD میں مبتلا خواتین کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ سال میں صرف ماہواری کے آٹھ سائیکل ہی پوری کرتی ہیں کچھ اس سے بھی کم۔دیگر علامات میں چہرے پر مسلسل ومتواتر مہانسوں کا نکلتے رہنا، غیر ضروری بالوں کا اگنا، خاص طور پر چہرے، بازؤں اور کمر وغیرہ پر، جلد پر داغ دھبے، درد شکم، موٹاپا، شادی شدہ خواتین میں بانجھ پن، ذیابیطس شکری، نیند نہ آنا، دل و دماغ کے بعض خاص امراض کا پیدا ہونا، اعصابی بگاڑ، بالوں کا نکلنا وغیرہ اس کی اہم علامات ہیں۔

تشخیص:۔

تشخیص بالبصر :۔ یہ طریقہ فوری آسان اور بغیر لاگت کا ہے۔

1۔عمر اور قد کو دیکھ کر وزن کی جانچ۔

2۔جسم کے ان حصوں اور اعضاء پر غیر ضروری بالوں کی پیدائش جہاں عام طور پر بال نہیں اگتے مثلاً Chest

-Chin & Face.

3۔بالوں کا گر جانا اور بھوسی Dandruff کی زیادتی۔

4۔چہرے پر مہانسوں (Acne Vulgaris) کا مسلسل اور متواتر نکلنا جو کمر اور بازؤں پر بھی نکل سکتے ہیں۔

5۔جلد پر داغ دھبے۔

6۔چھاتیوں کا بڑھ جانا وغیرہ۔

7۔ماہواری میں بے قاعدگی۔

ٹیسٹ وغیرہ۔

ابتدا میں ہی سب سے پہلے الٹراساونڈ سے اس کا پتہ چلتا ہے۔اس کے بعد جسم میں موجود ہارمونز کی لیول جانچی جاتی ہے۔حالانکہ ان میں بے اعتدالی کے دیگر اسباب و وجوہات جیسے تھائی رائیڈ کے امراض، خون میں Prolactin کی مقدار کی زیادتی وغیرہ بھی ہوسکتی ہے۔آج کل کچھ الگ نوعیت اور مخصوص ٹیسٹ بھی کرائے جاتے ہیں لیکن ان کی ضرورت خال خال ہی پیش آتی ہے۔اس لیے ان کا تذکرہ یہاں کرنا مناسب نہیں۔

کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ

1۔PCOD کا مطلب خالصتاً یا صرف Ovaries میں Cysts کی موجودگی نہیں۔الٹراساونڈ میں دکھائی دینے والے دراصل ناپختہ اور نامکمل انڈے ہوتے ہیں Cysts نہیں۔

2۔صرف ڈاکٹری (Allopathic) علاج میں لمبے عرصے تک کھلائی جانے والی مانع حمل دوائی (Birth Control Pills) ہی ماہواری میں باقاعدگی لانے کے لیے ضروری نہیں ہے نہ وہ اس کا مستقل علاج ہی ہے۔

3۔PCOD میں مبتلا خواتین مکمل طور پر بانجھ نہیں ہوتیں ہاں البتہ ان کا امید سے رہنا مشکل ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا حمل ٹھہر جائے اور ان کے یہاں بچے کی پیدائش بھی ہو۔

4۔وزن کم کرنا جو بہت ضروری ہے مشکل نہیں ہے اپنے ناموافق عادات پر قابو پانا، کھانے پینے میں احتیاط، ورزش کی باقاعدگی اور مناسب ادویات کے استعمال سے وزن کم کرنا ممکن ہے اور اگر 3% تک وزن کم ہو جائے تو PCOS کی علامات میں بہت حد تک تخفیف ممکن ہے۔ PCOS کے 70% مریضوں کو 40 سال کی عمر تک ذیابیطس شکری کا بہت زیادہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔

5۔بلڈ شوگر کم کرنے والی دوائی Metformin اس کی مثالی دوا نہیں ہے اس کا کوئی سائنسی ثبوت موجود نہیں ہے۔ یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے اس کا استعمال آنکھ بند کر کے نہیں کیا جانا چاہیے اور لمبے وقفے تک بھی نہیں۔

6۔اس دوائی کا اثر Non-insulin resistant والے PCOS کے مریضوں پر کچھ نہیں ہوتا البتہ یہ دوائی دوسرے

مریضوں کے جسم میں موجود شوگر میں تخفیف کر سکتی ہے۔

علاج و معالجہ:۔

ایلوپیتھی میں PCOD/PCOS کو لاعلاج بتایا جا رہا ہے۔ صرف احتیاطی تدابیر میں لائف اسٹائل تبدیل کرنے کی بات کی جاتی ہے۔

جس میں وزن کم کرنا، روزانہ ورزش کی عادت ڈالنا، ماہواری کی باقاعدگی کے لیے مانع حمل Birth Control Pills کا لمبے وقفے تک استعمال کرنا، چہرے اور دیگر جگہوں پر اگے غیر ضروری بالوں، بڑھے ہوئے ہارمونز کو اعتدال پر لانے اور مہانسوں کے لیے الگ الگ طور طریقے تلاش کرنا وغیرہ جیسی احتیاطی تدابیر سے کام لینا ہی اس کا علاج اس وقت دستیاب ہے لیکن بدقسمتی سے ان تدابیر کو اصل مرض کو ایڈرس کرنے میں کوئی اہمیت و افادیت نہیں ہے۔

ہومیوپیتھک علاج:۔

ہومیوپیتھک علاج جدید ترین علاج ہے جیسا کہ آپ نے پڑھا کہ PCOD/PCOS کی ایک مستحکم وجہ اس کا وراثت کے ذریعے نسل در نسل منتقل ہونا بھی ہے ہومیوپیتھی اس طرح کے دیگر مرضوں کے وراثت کے ذریعے منتقل ہونے پر یقین رکھتی ہے اگر اس پر مفصل بحث کرنی ہو تو ہمیں موجد ہومیوپیتھی ڈاکٹر سموئیل ہنی من کی میازم (Miasm) تھیوری کو دیکھنا ہوگا۔ ہومیوپیتھی میں PCOD

کی علامات میں قابلِ قدر تخفیف کے لیے بہت اچھی اور زود اثر دوائیاں موجود ہیں جو لاتعداد مریضوں کو حیرت انگیز طور پر فائدہ پہنچا رہی ہیں۔ ایسے لاتعداد مریض ہیں جن کے دیگر ادویات کے مسلسل استعمال سے چہرے مہانسوں سے بگڑ گئے تھے اور ہومیوپیتھک ادویات سے ٹھیک ہو گئے اسی طرح ایسے بھی لاتعداد مریض ہیں جن کا وزن فوراً ہی کم ہونے لگا اور دوسرے متعلقہ علامات میں بھی ناقابلِ یقین حد تک تخفیف ہونے لگی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دو چار کیس میرے پاس ایسے بھی ہیں جن کے الٹرا سونوگرافک رپورٹس بالکل نارمل بھی آئے حالانکہ وہ وہیں سے کرائے گئے تھے جہاں سے اس سے قبل کئی بار کرائے تھے اور ان میں پرانی پرابلم کو بہت علاج کے باوجود بھی بدستور موجود دکھایا گیا تھا۔

ہومیوپیتھک ادویات کا انتخاب مرض کو نہیں مریض کو دیکھ کر کیا جاتا ہے اسی لیے بظاہر ایک ہی مرض میں مبتلا مریض کے لیے جدا جدا اور منفرد علامات کی موجودگی اور خاندانی بیک گراؤنڈ کے اختصاص کی بنیاد پر تجویز کردہ دوائیاں بھی الگ الگ اور جداگانہ ہو سکتی ہیں۔ جب تک مریض کی پوری حالت و کیفیت کا بخوبی پتہ نہ چل جائے صحیح اور حسب حال دوائی کا انتخاب بھی ممکن نہیں اور پھر یہ دوا اور علاج ہر ایک کی پہنچ تک ہے، سستا اور بالکل بلاضرر بھی ہے۔

□□□

Dr.Bushra Ashraf

Sadrabal,Hazratbal,

P/O Kashmir University

Srinagar 190006 (Kashmir)

حسن کی نگہداشت

جسم کے غیر ضروری بال ختم کرنے کے لیے 5 آسان گھریلو ٹپس

خوبصورت دکھنا سب کا بنیادی حق ہے اور اس کے لیے آپ بھی مختلف پراڈکٹس اور ٹپس کا استعمال کرتے رہتے ہیں تاکہ خود کو حسین اور جاذب بنایا جاسکے۔ مگر جسم پر موجود غیر ضروری بال آپ کے حسن پر گرہن محسوس ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کی کچھ وجوہات ہوتی ہیں۔

آج کل خواتین میں نامناسب غذا، غیر متوازن ہارمونز، جسمانی کمزوری اور دیگر اندرونی مسائل کی وجہ سے غیر ضروری بال پیدا ہوتے ہیں اور اگر ان کو ویکسنگ اور تھریڈنگ سے صاف کیا جائے تو دن بہ دن ان کی جڑیں مضوط ہوتی جاتی ہیں اور یہ مردوں کے بالوں کی طرح سخت ہو جاتے ہیں۔

اگر آپ کو بھی یہی لگتا ہے کہ آپ کے بال دن بہ دن سخت ہو رہے ہیں یا جسم پر بال بڑھتے جا رہے ہیں خصوصاً چہرے اور ہاتھ پیروں پر تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ آپ ایسے گھریلو نسخوں کا استعمال شروع کر دیں جن سے آپ کی جلد کو نہ کوئی نقصان ہو اور نہ کوئی سائیڈ افیکٹ۔

5 گھریلو ویکسنگ ٹپس:

چینی اور شہد ویکس:

چینی اور شہد دونوں ہی ہماری خوبصورتی کو بڑھانے والے خاص قدرتی اجزا ہیں جو کسی بھی طرح استعمال کیے جائیں آپ کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

ایک گلاس پانی میں چینی کو اچھی طرح پکائیں اور اس میں ایک سے دو چمچ شہد ڈال دیں اور خوب پکائیں کہ ایک سخت سا مکسچر بن جائے اس کو نیم گرم ہونے پر غیر ضروری بالوں پر لگائیں اور دو سے چار منٹ بعد ہاتھ کی مدد دے اتارنے کی کوشش کریں اس سے آپ کو جلد چھٹتی ہوئی محسوس ہوگی اور زیادہ سے زیادہ بال زور سے کھینچنے میں خود ہی نکل آئیں گے اس طرح سے بالوں کی جڑیں بھی کمزور ہو جائیں گی اور نشوونما بھی کمزور ہو جائے گی۔

لیموں ویکس:

لیموں میں موجود سٹرک ایسڈ غیر ضروری بالوں کو ہٹانے میں مدد دیتا ہے اس لیے اگر آپ لیموں کے رس میں چینی اور شہد شامل کر کے بیس منٹ تک پکائیں اور بازار میں ملنے والے ویکس کی طرح سخت سا مکسچر تیار کر کے اپنی جلد پر لگائیں اور سوکھنے پر اتار لیں تو یہ بالوں کو جڑ سے نکالنے میں مدد دے گا۔ اس کو لگانے کے بعد آپ ایک سخت سا پرانا کپڑا کاٹ کر جلد پر چپکائیں اور کچھ دیر بعد اس کو کھینچ لیں جیسے سٹرپ کو کھینچتے ہیں۔ اس سے جلد کی میل بھی صاف ہو جائے گی اور بال بھی نکل جائیں گے۔

بیسن ویکس:

بیسن جلد کو تازگی فراہم کرنے میں بڑا مفید سمجھا جاتا ہے۔ بیسن کو ہلدی اور دودھ میں مکس کر کے گاڑھا پیسٹ بنائیں اور اس کو مطلوبہ جگہ پر لگالیں اور خشک ہونے کے بعد بالوں کی مخالف سمت میں انگلیوں کو گھمائیں ایسا کرنے سے بال جھڑ جائیں گے اور ویکس کی تکلیف بھی کم ہوگی۔

پپیتا ویکس:

پپیتے میں ایسے انزائمز پائے جاتے ہیں جو آپ کی جلد پر موجود غیر ضروری بالوں کے فولیکلز کو ختم کرنے میں مفید ہیں۔ تھوڑے سے پپیتے کو کچل کر ایک پیسٹ بنائیں اور اس میں ہلدی شامل کر کے پیسٹ تیار کر لیں اس کو جلد پر لگائیں اور سوکھنے پر انگلیوں کی مدد سے ہٹائیں اور چہرہ سادے پانی سے دھولیں۔

انڈے کی سفیدی:

انڈے کی سفیدی بالوں کو ختم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس کے لیے آپ دو چمچ مکئی کا آٹا اور ایک انڈے کی سفیدی مکس کر کے گاڑھا سا پیسٹ بنائیں اور لگالیں۔ پھر انگلیوں کی مدد سے صاف کر لیں۔ اس طرح بالوں کی نشوونما بھی کم ہوگی اور زیادہ بال بھی نہیں آئیں گے۔

مسوں کو ختم کرنے کیلئے 4 انتہائی آسان گھریلو نسخے

کیا آپ کے جسم پر مسے (اسکن ٹیگ) ہیں اور آپ ان سے پریشان ہیں تو اب پریشانی کی کوئی بات نہیں کیونکہ آپ گھر بیٹھے ان سے با آسانی جان چھڑا سکتے ہیں اور اس کے لیے ڈاکٹرز کے پاس جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔

عمومی طور پر مسے جسم کے کسی بھی حصے پر نکل آتے ہیں لیکن عموماً گردن اور اطراف میں پائے جاتے ہیں جبکہ زیادہ تر حاملہ خواتین یا درمیانی عمر کی عورتیں اس کا شکار ہوتی ہیں لیکن اب تک کسی بھی تحقیق سے مسے نکلنے کی وجوہات ثابت نہیں ہوسکیں۔

مسوں کا صحت پر کوئی مضر اثر نہیں پڑتا البتہ ان کی جسم پر موجودگی دیکھنے میں بُری لگتی ہے۔ بعض اوقات لوگ مسوں کو سرجری کے ذریعے بھاری رقم ادا کر کے ختم کرواتے ہیں لیکن حیران کن طور پر انتہائی آسان گھریلو نسخوں کے ذریعے ان سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بیکنگ سوڈا اور کیسٹر آئل

ویسے تو مسوں کو ختم کرنے کے بہت سے طریقے ہیں لیکن جسم کے کسی بھی حصے سے مسے کو نکالنے کا بہترین طریقہ بیکنگ سوڈا (کھانے کا میٹھا سوڈا) اور کیسٹر آئل کا پیسٹ ہے۔

دو چمچ میٹھے سوڈے میں ایک چمچ کیسٹر آئل شامل کر کے اس مرکب کو مسے پر لگائیں۔

اس عمل کو روزانہ دو سے تین بار دہرائیں اور اس وقت تک دہراتے رہیں جب تک مسہ خود ہی ختم نہ ہوجائے۔

ناخن پالش

ناخن پالش کے ذریعے بھی مسوں کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ کوشش کریں کہ بغیر رنگ والی ناخن پالش مل جائے، اگر دستیاب نہ تو کسی بھی رنگ والی ناخن پالش کو مسوں پر دن میں کم از کم 3 بار لگائیں۔

اس عمل کو 2 ہفتے تک جاری رکھیں، اگر مسے کا سائز تلِ (مول) جتنا ہو تو اس کے خاتمے میں ایک مہینہ بھی لگ سکتا ہے۔

باندھنا

مسے کو ختم کرنے کا ایک آسان طریقہ دھاگے کا استعمال بھی ہے۔ مسے کو دھاگے کے ذریعے باندھنے سے اس کی نشوونما رُک جاتی ہے اور سائز نہیں بڑھتا۔ مسے کو ایک ہفتے تک دھاگے سے باندھنے سے اس کا خاتمہ ہوسکتا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو احتیاطاً دھاگے کا استعمال نہ کریں کیونکہ ممکنہ طور پر مسہ میں درد اور سوجن ہوسکتی ہے۔

گھوڑے کی دم کا بال

یہ ایک قدیم نسخہ ہے۔ کسی کوچوان سے گھوڑے کا بال لے لیجئے اور اسے مسے کے گرد باندھئے۔ کہتے ہیں کہ اس سے چند روز میں مسہ جھڑ کر ختم ہوجاتا ہے۔

(بحوالہ: www.kfoods.com)

□□□

تاثرات: نگر نگر سے

'خواتین دنیا' کا مارچ کا شمارہ ملا۔ آپ کا اداریہ معلوماتی ہے جس طرح آپ نے ورجینا وولف اور سیمون دی بوائر کا حوالہ دے کر گفتگو کا آغاز کیا ہے اور بتایا ہے کہ مشرقی عورتوں نے بھی تقلید کرتے ہوئے اپنے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا، لیکن یہاں پر دنیا کی پہلی خواتین مصنفہ کا حوالہ دیا جاتا تو اور اچھا ہوتا۔ دنیا کی پہلی مشہور مصنفہ کو ''این ہیدوانا'' Enheduanna کے نام سے جانی جاتی ہے جو 23ویں صدی قبل قدیم میسوپوٹامیا میں رہتی تھی وہ ایک شہزادی کے ساتھ شاعرہ اور مصنفہ بھی تھی اسی سے متاثر ہو کر مغربی خواتین لکھنے کی طرف راغب ہوئیں۔ اس کے بعد سینکڑوں خواتین نے اپنے خیالات وجذبات کا اظہار اپنے فکشن، ناول، افسانوں اور شاعری میں کیا جن میں ورجنا وولف، جین آسٹن، جارج ایلیٹ، ہارپر لی، ڈورس لیسنگ، ٹونی موریشن وغیرہ نمایاں نام ہیں۔ ہندوستان کی خواتین قلمکار بھی پیچھے نہیں رہیں اروندھتی رائے، جھومپا لاہاری، عصمت چغتائی، سروجنی نائیڈو، سُدھا مرتھی وغیرہ کے نام prominent ہیں۔ اداریے میں آپ نے خواتین کی آزادی سے متعلق بھی بات کی ہے جو بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر نشاں زیدی کا رفیعہ شبنم عابدی سے لیا گیا انٹرویو بہت معلوماتی ہے۔ ہر ایک پہلو پر عابدی صاحبہ نے بیباکی سے جواب دیے ہیں خاص طور پر یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے نو سال کی عمر میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا اور جب وہ انٹر میں تھیں تو ان کا افسانہ 'بیسویں صدی' جیسے رسالے میں شائع ہوا تھا۔ اسی طرح کرشن چندر کی کہانی 'نیا خزانہ' کا بھی انھوں نے ذکر کیا ہے اور کرشن چندر کا یہ قول پیش کیا ہے جو واقعی بہت متاثر کرتا ہے:

''بچہ بہت کچھ کرنا چاہتا ہے۔ وہ بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن وہ بہت کچھ کر نہیں سکتا کیوں کہ یہ دنیا بچوں کی نہیں بڑوں کی دنیا ہے''۔

ڈاکٹر حمیرہ تسنیم نے 'ناولٹ نگار اردو خواتین' میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس اور توبتہ النصوح سے مضمون کی شروعات کرتے ہوئے عصمت چغتائی، قراۃ العین حیدر، جیلانی بانو، جمیلہ ہاشمی اور آمنہ ابوالحسن کے ناولوں کا بھرپور تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ ایک بہترین مضمون ہے۔ نسیم سعید کا مضمون 'فن اور ہندوستانی خواتین' میں امرتا شیرگل، نسرین محمدی، بیلینی مالتی وغیرہ کی مصوری کے سلسلے میں جان کر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

افسانوں میں روبینہ ساگر روبی کی کہانی 'حسرتوں کی قبر پر' میں دلکش منظر نامہ پیش کیا گیا ہے جس میں نافل ارتاش اور نبراس مرزا کے کردار اہم ہیں۔ افسانے میں منفرد کردار، دلکش منظر نامہ اور دلچسپ اختتام ہے۔ 'خواتین دنیا' کے لیے دعا گو ہوں۔

استوتی اگروال، اگروال جیولرز، سرونج، ایم پی

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

درسِ بلاغت

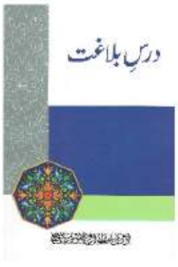

ادارہ

صفحات:230

قیمت:85روپے

قومی یکجہتی ایک مطالعہ اور تجزیہ

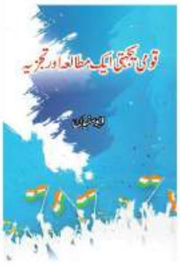

مصنف:ابوسفیان

صفحات:203

قیمت:110روپے

گوپال متل (مونوگراف)

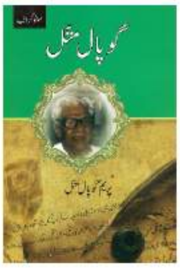

مصنف:پریم گوپال متل

صفحات:117

قیمت:80روپے

گرونانک:حیات وخدمات

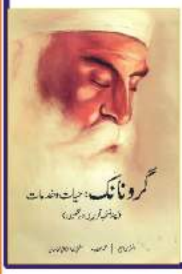

مرتبین:اختر الواسع،محمد حبیب

مفتی محمد مشتاق تجاروی

پہلی اشاعت:2020

صفحات:190، قیمت:110روپے

ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات

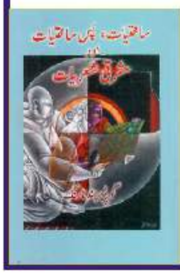

مصنف:گوپی چند نارنگ

دوسری طباعت:2020

صفحات:620

قیمت:275روپے

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں

مصنف:گوپی چند نارنگ

دوسری طباعت:2020

صفحات:364

قیمت:175روپے

انیس (سوانح)

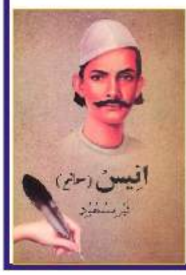

مصنف:نیر مسعود

دوسری طباعت:2020

صفحات:427

قیمت:220روپے

کوثر چاندپوری (مونوگراف)

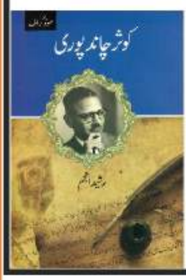

مصنف:رشید انجم

صفحات:150

قیمت:90روپے

شعبۂ فروخت:قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly November 2020, Vol. 4, Issue: 11 RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025